ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مختصر حواشی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اس میں

مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کردیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں۔

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ○ صفحات: ۱۵۸۴ ○ کاغذ: امپورٹڈ مکینیکل ○ ہدیہ: ۱۵۰/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

فون نمبر: [illegible]

پوسٹ بکس نمبر: ۱۳۳۳

جلد ۱۱۶ جنوری ۱۹۹۳ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۳۴۰

جلد ۱۱۶ جنوری ۱۹۹۲ء رجب ۱۴۱۲ھ عدد ۵

فہرست مضامین

رابطہ و ترسیل زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ — پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے — زر سالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عبد محمد پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

اشارات

ایسے اجتماعی مقاصد و اہداف کے حصول کی خاطر جو لوگ الگ الگ حاصل نہ کر سکیں' وہ گروہوں اور تنظیموں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ خاندان کا بالکل بنیادی' مگر غیر رسمی' ادارہ اس لیے بنتا ہے کہ مرد اور عورت تنہا نسلِ انسانی کی تولید و بقا کا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ حکومت اس لیے بنتی ہے کہ سارے افراد مل کر بھی' حکومت کی تنظیم کے بغیر' معاشرہ کی بقا و ترقی کا کام نہیں کر سکتے۔ تنظیم کی وجہ سے ہی ایٹم بم بن سکا' بڑی بڑی جنگیں لڑی جا سکیں' وسیع پیانہ پر تعلیم و علاج جیسی سہولتیں فراہم کی جا سکیں اور تجارتی ادارے بین الاقوامی بن سکے۔

ایسے اجتماعی گروہوں کے اپنے مقصد کی طرف پیش رفت کے لیے' مقصد سے محبت اور وابستگی کے' بعد سب سے زیادہ اہم اور ضروری کام منصوبہ بندی (پلاننگ) اور اس کی تنفیذ ہے۔ یہ گروہ قومیں ہوں یا ادارے اور تنظیمیں' اور تنظیمیں تجارتی و سرکاری ہوں یا علمی' سیاسی' معاشرتی' اصلاحی اور انقلابی۔ ایک تنظیم کے اہداف اگر مستقبل میں واقع ہیں' اسے اگر کسی راستے پر آگے بڑھنا ہے' کل کہیں پہنچنا ہے' کوئی ہدف حاصل کرنا ہے' تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ یہ سوچے کہ آج اسے کیا کرنا چاہیے' کن کاموں کو ترجیح دینا چاہیے' کس راستے سے پیش قدمی کرنا چاہیے' تاکہ کل وہ اپنے ہدف اور اپنی منزل سے کچھ اور قریب ہو سکے۔ ایسی ہی سوچ' اور ایسے ہی کاموں اور راستوں کے تعین کا نام منصوبہ بندی ہے۔

منصوبہ بندی اس چیز کا نام نہیں ہے کہ ہم جو کام عرصہ سے کرتے چلے آرہے ہیں' یا آج کر رہے ہیں' ان کی ایک فہرست بنا لیں اور کاغذ پر ان کو دہرا دیں۔ منصوبہ بندی تو مستقبل کے خوابوں اور آرزوؤں کا نام ہے' وہ طویل المیعاد ہوں یا قصیر المیعاد' اور ایسے کاموں اور راستوں کے تعین کا نام ہے جن سے یہ آرزوئیں اور خواب پورے ہو سکیں' اور پورے نہ بھی ہوں تو ان کا پورا ہونا ممکن ہو جائے۔ پھر' اگر اللہ چاہے اور ہماری نیتیں اور کوششیں صحیح اور موزوں

ہوں' تو ہمارا مطلوب' جو ممکن بن جائے' وہ حاصل بھی ہو جائے اور ایک حقیقت میں تبدیل ہو جائے۔

کل کے لیے آج سامان کرنا انسانی فطرت کا بنیادی تقاضہ ہے۔ بلکہ جانور بھی کل کا اہتمام کرتے ہیں' اور آج کے اچھے موسم میں کل کے برے موسم کے لیے خوراک و ضروریات ذخیرہ کرتے ہیں۔ اگر وہ کل کا نہ سوچیں اور آج کی محنت کا پھل آج ہی کھا لینا چاہیں یا آج کا کام دہراتے رہنے ہی کو اپنی منزل سمجھ لیں' تو کل وہ بھوکے مر سکتے ہیں۔ آج (دنیا میں) اپنے کاموں پر نگاہ رکھنا اور وہ کام کرنا جو کل (آخرت میں) کام آئیں' یہی' ایمان کا اصل تقاضہ ہے' بلکہ اس کا حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الحشر)

"اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔"

دوسرے الفاظ میں' دنیا کی زندگی آخرت کے لئے مسلسل منصوبہ بندی' اس کے جائزہ اور احتساب میں گزرنا چاہیے۔ صبح اٹھتے ہی استغفار اور نئے عزائم و ارادے' دن بھر کام اور محنت' اور دن ختم ہو تو اپنا جائزہ اور احتساب۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کی سوچ اور اس کے عمل دونوں کا آخرت کے لیے منصوبہ بندی کا تابع ہونا مطلوب ہے۔ اس طرح مومن کا مزاج ہی مستقبل پر نظر رکھنے اور مستقبل کے لیے کام کرنے کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے۔ جب مزاج مستقبل بینی اور مستقبل سازی کا عادی ہو جائے' تو دنیا میں بھی زندگی کے گوشے اور مقاصد اس عمل سے خالی نہیں ہو سکتے۔ نفعِ عاجلہ کی محبت کے باوجود تعمیرِ مستقبل کا یہ فطری جذبہ ہی ہے جو مرد اور عورت کو خاندان بنانے' ایک طالب علم کو برسوں حصولِ علم میں صرف کرنے اور انسانوں کو اس نوعیت کے بے شمار کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ جب ایسا ہے تو ایسی تنظیم اور ایسے افراد جو دنیا کو اللہ تعالیٰ کے مطلوب نقشے کے مطابق بنانے کا ہدف رکھتے ہوں' اس بات سے کبھی غافل نہیں ہو سکتے کہ وہ آج اس دنیا میں بھی دنیا ہی میں کل کے مطلوب نقشے کے لیے منصوبہ بندی کریں۔ وہ یہ سوچیں کہ آنے والی کل کے لیے ان کے خواب اور آرزوئیں کیا ہیں' اور آج وہ کیا اور کن راہوں سے جستجو کریں کہ یہ خواب اور آرزوئیں پوری ہو سکیں۔

اسی لیے جماعتِ اسلامی ابتدا ہی سے کسی نہ کسی شکل میں اپنے مستقبل کے کاموں کی منصوبہ بندی کرتی رہی ہے۔ یہ منصوبے مختلف المیعاد مدتوں پر محیط رہے ہیں۔ کبھی کسی میعاد کے

تعین کے بغیر، کبھی پانچ سال کے لیے اور کبھی ایک سال کے لیے۔ ایک عرصہ تک ہر سال سالانہ منصوبہ بنانے کے بعد، ۱۹۸۹ میں جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے ایک اہم بنیادی فیصلے کے ذریعے منصوبہ بندی کے عمل کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک طرف اس نے ایک پانچ سالہ منصوبہ برائے ۱۹۹۰-۱۹۹۴ منظور کیا۔ اس منصوبے میں پانچ سال کے لیے عمومی اہداف متعین کیے گئے، ان اہداف کے درمیان ترجیحات قائم کی گئیں، اور توسیع دعوت، رابطہ عوام، تربیت اور استحکام نظم کے اہم میدانوں میں اہداف، رہنما اصول، خطوط کار اور مستقل نوعیت کی تدابیر و پروگرام بھی درج کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ہر سال، ہر سطح پر، اسی پانچ سالہ منصوبے کے مطابق اور اس کے ضمیمے کے طور پر، ایک سالانہ منصوبہ عمل طے کیا جاتا رہے گا۔ اس سالانہ منصوبہ عمل میں وہ متعین کام طے کیے جائیں گے جن کو دوران سال کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ساتھ ہی، اگر کوئی خصوصی اہداف سال آئندہ کے لیے ضروری ہوں گے تو وہ بھی طے کر دیے جائیں گے۔

اس فیصلے کے تحت مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۷-۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ء میں، پانچ سالہ منصوبے (۱۹۹۰-۱۹۹۴) کے تحت، ۱۹۹۲ کے لیے مرکزی اور ملکی منصوبہ عمل طے کیا، اور ساتھ ہی ہر سطح کے نظم کو ہدایت کی کہ وہ سال رواں کے لیے اپنا منصوبہ عمل تیار کرے۔ پانچ سالہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے، اور سالانہ منصوبہ عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ جماعت کے سارے ذمہ داران اور کارکنان منصوبے کی سوچ، اس کے اہداف و ترجیحات اور اس کے رہنما اصولوں کو اچھی طرح سمجھیں اور اپنے سارے کاموں اور فیصلوں میں ان کو ملحوظ رکھیں۔ اس لیے ان کے سامنے منصوبے کے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

آج اس دنیا میں ہمارے کام کے مستقبل کا جو نقشہ ہماری آرزو بن جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم ایک عام مسلمان کو، ملتِ اسلامیہ کے ایک عام فرد کو، مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، اپنی توجہات اور سرگرمیوں کا مرکز بنائیں اور اسے جس حد تک بھی ممکن ہو دین کے لیے کھڑا کریں۔ جتنا بھی وہ اسلام کے قریب آسکے، جتنا بھی اس کے ایمان میں اضافہ ہو سکے، جتنی بھی اس کی فکر اور اس کے اخلاق و عمل میں اصلاح و بہتری ہو سکے، وہ بہر صورت کرنا اور کرتے رہنا ناگزیر ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کو اقامت دین کے لیے کھڑا کرنا اور اس مقصد کے لیے وہ، اپنی کمزوریوں کے باوجود، جو کچھ بھی عمل کر سکے وہ کرا لینا، اور کراتے رہنا بھی اتنا

ہی ناگزیر ہے۔ کوئی وقت دے گا' کوئی مال دے گا۔ کوئی صرف کلمہ خیر کہے گا۔ کوئی اجتماعات میں آئے گا' کوئی جلوس میں شریک ہو جائے گا' کوئی دعوتی مہم میں ساتھ نکل کھڑا ہوگا۔ مستقبل کے اس نقشہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے لئے مجلس شوریٰ نے دعوت الی اللہ کو اولین ترجیح دی ہے' اور اس کی روح اور مقصد کو یوں واضح کیا ہے کہ

> دعوت کی روح اور مقصد' عام آدمی کو مخلصانہ بندگی رب' تجدید ایمان' وفائے عہد اور طلب جنت کے لیے کھڑا کرنا ہو۔ اور اس کے ناگزیر تقاضہ کے طور پر' اقامت دین کے لیے' اللہ کی راہ میں جان لگا کے اور مال خرچ کر کے' جہاد کے لیے تیار کرنا ہو۔ (پانچ سالہ منصوبہ ص ۳)

دعوت الی اللہ کے کام میں جو سوچ مستقبل کے نقشے کو بروئے کار لانے کے لیے ناگزیر ہے وہ اس رہنما اصول سے عیاں ہو جاتی ہے۔

> ہر شخص جو اس دعوت سے ہمدردی رکھتا ہو' یا اس کے لیے کچھ کر سکتا ہو اور کرنے کو تیار ہو' ہمارا آدمی ہے' اور اس کو ساتھ لے کر چلنے کی ذمہ داری ہماری ہے۔ جہاں ایک طرف پوری طرح قابل اعتماد کارکنوں کی ایک ٹیم بنانا ضروری ہے' وہاں ان سب لوگوں سے بھی اسلامی انقلاب کے لیے کام لینا ضروری ہے' خواہ ان میں کتنی ہی خامیاں پائی جاتی ہوں۔ (منصوبہ ص ۶)

ہر عام مسلمان کے بارے میں اپنی اس ذمہ داری کو کماحقہ ادا کرنے کے لیے ایک طرف یہ انتہائی اہم اصول ہر وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ

> دعوت کی اصل کامیابی مخاطب کو کسی نہ کسی عمل کے لیے آمادہ کر لینا ہے' خصوصاً دعوت و تنظیم کے کام کے لیے' خواہ وہ عمل کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ (منصوبہ ص ۶)

اور اس سوچ پر عمل پیرا ہونا بھی ناگزیر ہے' جو بدقسمتی سے اب ہم بھول سے چکے ہیں۔

> ہر شخص سے یہ امید رکھی جانی چاہیے کہ وہ دعوت قبول کر سکتا ہے' خواہ وہ ناخواندہ یا ہمارا کٹر مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کسی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ (منصوبہ ص ۶)

اگر ہم پہلے ہی سے فرض کر لیں کہ فلاں پیپلیا ہے اور فلاں مسلم لیگی' فلاں کا کردار خراب

ہے اور فلاں مغرب زدہ ہے' اور فلاں ہمارا دشمن ہے' اور اس سے ربط و دعوت بے کار ہے' تو یہ سوچ داعیانہ مزاج کی نہیں' قبائلی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ اسی طرح صرف تقریریں سنوا دینا اور کتاب پڑھوا دینا بھی فی نفسہ مقصود نہیں۔ اصل مقصود تو اس کے عمل میں کوئی اچھی تبدیلی لانا ہے' اور اس سے اقامت دین کی راہ میں کچھ نہ کچھ حاصل کر لینا ہے۔

اسی مقصد کے حصول کے لیے ایک اہم اور ناگزیر راستہ فرد اور فرد کے مابین ربط اور دعوت کا راستہ ہے۔ اس کام کے لیے کسی سرکلر اور ہدایت کی ضرورت نہ ہونا چاہیے۔ یہ کام رپورٹوں اور احتساب کے بل پر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوتے اپنے اندر سے پھوٹنا چاہییں۔ اگر ہم میں سے ہر فرد خود اپنے کام کی منصوبہ بندی کرے' اپنے رشتہ داروں' پڑوسیوں' ساتھ کام کرنے والوں' دوستوں اور شناساؤں میں صرف ۱۰ ناموں کی فہرست بنا لے' اور یہ طے کرے کہ ان میں سے ہر ایک تک پہنچنا ہے' اور ان میں ہر ایک سے کچھ نہ کچھ کرا لینا ہے' تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے دعوتی کام اور ہمارے وسائل میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جائے گی۔

عام مسلمان کو جس طرح دین کے لیے کھڑا کرنا مطلوب ہے اس کے لیے صرف انفرادی روابط کافی نہیں ہو سکتے' اور نہ ہر فرد کا تنہا' علیحدہ علیحدہ دعوتی کام۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ہم نے ایک طویل عرصہ محنت کر کے جو اجتماعی قوت جمع کی ہے اس کو دعوت کے کام میں منظم طریقے سے لگایا جائے۔ آج کے دور کے وہ تمام اجتماعی ذرائع استعمال کیے جائیں جو ناجائز نہ ہوں' اور ہمارے بس میں ہوں۔ دعوت کو وقت کے بھڑکتے ہوئے مسائل کے ساتھ مربوط کیا جائے۔ ان مسائل کو ہاتھ میں لیا جائے اور ان کے لیے اسلام کی رہنمائی پیش کی جائے۔ وفود نکالے جائیں۔ کیمپ منعقد کیے جائیں۔ ابلاغِ عامہ کے قدیم و جدید ذرائع استعمال کیے جائیں۔

اس غرض کے لئے ہر جماعت کو چاہیے کہ وہ اپنے علاقے میں ایک ایک گھر دعوت پہنچانے کا منصوبہ بنائے۔ ایک متعین مدت میں ہر گھر تک ایک دفعہ ضرور دعوت پہنچا دے۔ ہر علاقے میں کیمپ لگائے اور وفود نکالے۔ یہ کام کسی ایک مرکزی مہم کے طور پر نہیں ہو سکتے۔ لیکن ہر مقام اور ہر علاقے میں' اپنی اپنی استطاعت و گنجائش اور سہولت کے لحاظ سے یہ کام ہونا چاہیے۔

دعوت کے ضمن میں عورتوں کے درمیان توسیعِ دعوت کے سلسلے میں خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔ عورتیں ہماری آبادی کا نصف حصہ ہیں۔ گھروں کی حکومت ان کے ہاتھوں میں ہے۔ نئی

نسل کی تعلیم و تربیت ان کے ذمے ہے۔ غیر اسلامی فکر و ثقافت کی جو یلغار ہماری خوابگاہوں میں داخل ہو رہی ہے اس کے آگے وہی بند باندھ سکتی ہیں' بلکہ اس کو نکال باہر کر سکتی ہیں۔ یہ سمجھنا سخت نادانی ہوگی کہ خواتین میں دعوت کا کام صرف خواتین کے نظم کی ذمہ داری ہے۔ جماعت کا کون کارکن ایسا ہے جس کا ربط خواتین سے نہ ہو۔ کہیں وہ ماں ہے' کہیں بہن ہے' کہیں بیوی ہے' کہیں بیٹی ہے' کہیں کسی اور رشتہ میں منسلک ہے۔ ان کو دعوت کے لیے کھڑا کر دینا' منظم کرنا اور کام کرانا' ہم میں سے ہر ایک کی ذمہ داری ہے' نہ کہ صرف حلقہ خواتین کی۔

اس لیے ہر جگہ جماعت کے کارکنوں اور نظم کو آگے بڑھ کر عورتوں کو تحریک کے دائرہ میں متحرک و منظم کرنے کی ذمہ داری پوری کرنا چاہیے۔ کام اپنے گھروں سے شروع کریں۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا اور وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کے جذبہ سے سرشار ہو کر۔ کوئی مقام ایسا نہ رہے جہاں مردانہ نظم موجود ہو' اور وہاں عورتوں میں دعوت کا حلقہ منظم نہ ہو۔

عورتیں اگر ہماری اس عام آبادی کا نصف حصہ ہیں جس کو دین کے لیے کھڑا کرنا مستقبل کا سب سے بڑا اور اہم کام ہے' اور ان کے درمیان دعوت کے کام سے غفلت برتنا ایک جرم سے کم نہ ہوگا' تو اس حقیقت کو نظرانداز کرنا بھی بہت بڑی کوتاہی ہوگی کہ مردوں اور عورتوں دونوں میں ۸۰ فیصد لوگ ان پڑھ ہیں' اور جن ۲۰ فیصد کا شمار پڑھے لکھوں میں ہوتا ہے ان میں سے ایک فیصد بھی پڑھنے کا ذوق اور شوق نہیں رکھتے۔ اسی لیے ہمارے ہاں بالعموم ایک نئی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہزار دو ہزار سے زیادہ مشکل ہی سے چھپتا ہے۔ اور اگر کوئی کتاب اپنی پوری عمر میں دس ہزار چھپ جائے تو اسے بہت بڑی بات سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ ان ملکوں میں جہاں لوگ پڑھنا جانتے ہیں' اور پڑھنا چاہتے ہیں' بعض پہلے ایڈیشن ہی لاکھ دو لاکھ کی تعداد میں چھپتے ہیں' اور ایک مقبول عام کتاب دس لاکھ سے تجاوز کر کے ایک کروڑ تک چھپ سکتی ہے۔ اور بک بھی جاتی ہے۔

کتاب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ کتاب ان لوگوں تک دعوت پہنچاتی ہے جو معاشرہ کی رہنمائی کرتے ہیں' اور ان کو متاثر کیے بغیر معاشرہ میں کوئی پائیدار اور گہری تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ ہمارا تو دین الکتاب ہی پر قائم ہے' اور ہماری تحریک کی ساری نشوونما میں لٹریچر نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ لیکن جب الکتاب نازل ہو رہی تھی اس وقت بھی اس کے ابلاغ و تعلیم کا انحصار زبان (قل) اور سمع پر تھا۔ بلکہ ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے کہ انسانوں کے درمیان وسیع پیمانہ پر ابلاغ و تعلیم انہی ذرائع پر منحصر رہی ہے۔ لیکن اب تو ٹیلیویژن' ریڈیو' اور آڈیو ویڈیو کیسٹ نے

بولنے اور سننے کے ذریعہ ابلاغ کے عمل کو اتنا پھیلا دیا ہے اور ایسی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے کہ اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ابلاغ کے اس عمل کے ذریعے ہم اپنے ملک کی اس ۹۹ فیصد سے زیادہ آبادی تک باسانی دین کی تعلیم پہنچا سکتے ہیں' اور ان کو دین کے لیے سرگرم عمل کر سکتے ہیں' جو پڑھنا نہیں جانتے' یا اگر جانتے ہیں تو پڑھنا نہیں چاہتے۔ اور یہ آبادی ہمارے مستقبل کے نقشہ میں مرکزی اہمیت رکھتی ہے۔

سب سے ضروری بات تو اس ضمن میں یہ ہے کہ ہم اس آبادی کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کو وہ توجہ دیں جس کی یہ مستحق ہے۔ دعوت کی روح اگر یہ ہے کہ لوگوں کا تعلق اپنے رب سے جوڑا جائے' اور جو دوڑ دوڑ کر آگ میں گر رہے ہیں ان کو کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے بچایا جائے (کما قال صلی اللہ علیہ وسلم) تو ایک ان پڑھ آدمی کسی پڑھے لکھے آدمی سے کچھ کم یہ حق نہیں رکھتا کہ ہم اس تک اپنی دعوت پہنچائیں' اور اس کو جماعت میں شامل کریں۔ پڑھ نہ سکنے یا نہ پڑھنے کو اگر کسی مرد یا عورت کو جماعت سے باہر رکھنے کی بنیاد بنایا جائے تو اس سے بڑھ کر ستم اور کیا ہوگا' اور دعوت و تحریک کے صحیح فہم سے نابلد ہونے کی دلیل اور کیا ہوگی۔ اگر کوئی پڑھ نہ سکتا ہو' اور ۸۰ فیصد نہیں پڑھ سکتے' تو ان کو اپنی دعوت پہنچانے اور سمجھانے کے ذرائع فراہم کرنے کے لیے ہم ذمہ دار ہیں' اور جواب دہ ہوں گے' نہ کہ وہ جو پڑھنے کے استعداد نہیں رکھتے۔

یہ نہ سمجھیں کہ جو پڑھا لکھا نہیں وہ لازماً جاہل اور جوہر قابل سے خالی ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی جاہل اور جوہر قابل سے خالی ہوتے ہیں۔ بلکہ آج تیسری دنیا میں سارے امراض و مصائب کے ذمہ دار پڑھے لکھے لوگ ہی ہیں۔ ہم تلاش کریں گے تو ان گدڑیوں میں بھی بے شمار بیش قیمت لعل پائیں گے۔

اس مقصد کے لیے دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ہم اپنی دعوت کو گفتگو اور خطاب کے ذریعے پہنچانے پر توجہ دیں۔ ایک کاغذ یا کتاب ہاتھ میں تھمانے ہی کو دعوت کا کام نہ سمجھیں۔ جو پڑھنا چاہتا ہو اس کو کتاب دے کر بھی گفتگو سے مستغنی نہیں ہوا جا سکتا لیکن جو پڑھ ہی نہ سکتا ہو اس تک اپنی بات پہنچانے کے لیے تو بات چیت کے علاوہ اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ جس قدر بھی سمعی و بصری وسائل اب تک فراہم ہو چکے ہیں ہم ان کا بھرپور استعمال کریں۔ آڈیو ویڈیو کیسٹ اپنے پاس رکھیں' اور ان کی لائبریریاں بنائیں۔ نشستوں اور مجلسوں میں ان کو استعمال کریں۔ دکانوں' محلوں اور گاڑیوں میں لگائیں۔

عام لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا اسی وقت ممکن ہوگا جب ایسے لوگ بھی اس دعوت کے ہم نوا اور علمبردار بن جائیں جو معاشرہ میں اثر و نفوذ کے حامل ہیں۔ گاؤں کے چودھری' برادریوں کے سربراہ' سیاسی لیڈر' علما اور ائمہ مساجد' معلمین اور اساتذہ' پیشہ ور ماہرین' تاجر اور صنعتکار' سرکاری ملازمین' یہ سب آج کے معاشرہ میں ایک گونہ قبائلی سرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو اسلام کی دعوت کے دائرہ میں لائے بغیر معاشرہ کی باگ دوڑ اسلام کے ہاتھ میں آنا کسی طرح ممکن نہیں۔

کسان اور مزدور ہونا' معاشی حیثیت سے' معاشرہ میں پس ماندہ ہونے کی علامت ہے۔ کسان ہماری عام آبادی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ ہر معاشرہ میں شہری آبادی نسبتاً کہیں زیادہ اثر و نفوذ کی حامل ہوتی ہے' لیکن بیلٹ بکس میں ایک شہری اور دیہاتی کا وزن برابر ہوتا ہے۔ کسان قیام پاکستان کے وقت سے ہی غفلت اور عدم توجہ کا شکار ہے۔ اس لیے کہ قیادت ان جاگیرداروں کے ہاتھ میں رہی ہے جو خود شہروں میں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کسانوں کی رعیت کو بھیڑ بکری کے گلوں کی طرح جدھر چاہیں ہانک سکتے ہیں۔ بغیر کسی طبقاتی آویزش کی حوصلہ افزائی کے' کسان تک دعوت پہنچانے اور اس کو دین کے لیے کھڑا کرنے کے کام پر بھی ہم کو کماحقہ اپنے وسائل اور توجہات لگانے کے لیے عملی اقدامات کرنا ہوں گے۔

پانچ سالہ منصوبے کا ہر پہلو اہم ہے' اور یہاں صرف چند اہم پہلوؤں ہی کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ مگر منصوبہ خود کوئی کام نہیں کرتا۔ نہ منصوبہ کوئی جادو کی چھڑی ہے کہ اس کو منظور کرنے اور چھاپ کر شائع کر دینے سے ہی سارے کام ہونے ہوں۔ منصوبہ اسی حد تک کارگر ہوگا جس حد تک ہم اسے کارگر کریں گے۔ ورنہ یہ کاغذ کے ان ٹکڑوں سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا جن کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں۔ اس لیے اصل اہمیت تو ارادہ و عزم' ہمت و حوصلہ' اور سعی و محنت کی ہے' جن کے بغیر نہ کوئی راستہ طے ہو سکتا ہے' نہ کوئی منزل سر ہو سکتی ہے' نہ کوئی ہدف حاصل ہو سکتا ہے۔

نظم کی ہر سطح پر بالکل بنیادی طور پر دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنے اپنے دائرہ کار میں' حلقہ ہو یا مقام' تحصیل و ضلع ہو یا صوبہ' شعبہ ہو یا ادارہ' سال بھر کے لیے اپنا منصوبہ' عمل بنائیں۔ یہ منصوبہ' عمل ان ٹھوس اور متعین کاموں پر مشتمل ہو جن کا کرنا بھی محسوس ہو' اور جن کے نتائج بھی محسوس۔ خواہشات اور تمناؤں اور نصائح و ہدایات کا نام منصوبہ' عمل

نہیں۔ نہ صوبہ کی سطح سے لے کر مقام تک مرکزی منصوبہ عمل کو نقل کرتے چلے جانے کا نام منصوبہ عمل ہے۔ اپنے لیے' کام کے ہر دائرہ میں' واضح و متعین اہداف اختیار کرنا' پھر ان کے حصول کے لیے عملی اقدامات کرنا' پھر وقفہ وقفہ سے دیکھتے رہنا کہ یہ اہداف کہاں تک حاصل ہوئے ہیں' یہی وہ عمل ہے جس سے کام آگے بڑھ سکتے ہیں۔ جن اہداف کو میزان پر رکھ کر کارکردگی کو جانچنے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا' ان کا مقام منصوبہ عمل نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی سوچ میں بنیادی تبدیلی لانا ہوگی۔ ہم خود کو اپنے مقام یا حلقے میں' اپنی تحصیل و ضلع میں' یا اپنے صوبے میں صرف جماعت کے وابستگان کے لیے ذمہ دار اور مسئول نہ سمجھیں۔ بلکہ پوری آبادی کے لیے ذمہ دار اور مسئول سمجھیں۔ ہمارے حلقے یا مقام میں جتنے مرد و عورت' بوڑھے اور جوان' پڑھے لکھے اور ان پڑھ' کسان اور مزدور' بااثر و معزز افراد رہتے ہوں وہ سب ہماری سوچ' توجہ' اور کام کا ہدف ہوں۔ اپنی سوچ اور عمل کے دائرہ کو اس طرح وسیع کر کے ہی ہم اپنے منصوبہ کے خواب کو پورا کرنے کے قریب آسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد کرے' ہماری نیتوں کو خالص رکھے' جو کام کریں صرف اسی کے لیے کریں' اور ہر خلق خدا کے بارہ میں اپنی مسئولیت کو پورا کرنے کی فکر اور حوصلہ عطا کرے۔ آمین۔

بقیہ: حکمت مودودی

دیکھنا چاہتے انھیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھادی گئی ہے اس کے اجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں انھیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو۔ جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مُصر ہیں اس کی طرف جانے کے لیے انھیں چھوڑ دو۔

تفہیم القرآن جلد اوّل سورۃ الانعام۔ حاشیہ ۲۲' ۲۳' ۲۴' اور ۷۱

حکمتِ مودودیؒ

داعی الی اللہ کی ذمّہ داری

اللہ نے حق اور باطل کی کشمکش کے لیے جو قانون بنا دیا ہے اسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ حق پرستوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں۔ اپنے صبر کا' اپنی راستبازی کا' اپنے ایثار اور اپنی فدا کاری کا' اپنے ایمان کی پختگی اور اپنے توکل علی اللہ کا امتحان دیں۔ مصائب اور مشکلات کے دور سے گزر کر اپنے اندر وہ صفات پرورش کریں جو صرف اسی دشوار گزار گھاٹی میں پرورش پا سکتی ہیں۔ اور ابتداءً خالص اخلاق فاضلہ و سیرت صالحہ کے ہتھیاروں سے جاہلیت پر فتح حاصل کر کے دکھائیں۔ اس طرح جب وہ اپنا اصلح ہونا ثابت کر دیں گے تب اللہ کی نصرت ٹھیک اپنے وقت پر ان کی دستگیری کے لیے آپہنچے گی۔ وقت سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آسکتی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے تھے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدتیں گزر گئی ہیں اور کسی طرح یہ راستے پر نہیں آتی تو بسا اوقات آپؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے ان لوگوں کا کفر ٹوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کرلیں۔ آپؐ کی اسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو۔ جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدریج سے ہم اس کام کو چلوا رہے ہیں اسی پر صبر کے ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے؟ مگر ہم جانتے ہیں کہ جس فکری و اخلاقی انقلاب اور جس مدنیت صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم مامور کیے گئے ہو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے۔ تاہم اگر لوگوں کے موجودہ جمود اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا' اور تمہیں گمان ہے کہ اس جمود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے' تو خود زور لگاؤ اور تمہارا کچھ بس چلتا ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ بے یقینی کو یقین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ مگر ہم سے امید نہ رکھو کہ ہم تمہاری یہ

خواہش پوری کریں گے کیونکہ ہماری اسکیم میں اس تدبیر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طور پر راست رو بن جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے اور مومنوں سے کفار کے مقابلہ میں جدوجہد کرانے اور دعوتِ حق کو تدریجی تحریک کی منزلوں سے گزروانے کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک ہی تخلیقی اشارہ سے انجام پاسکتا تھا۔ لیکن اللہ اس کام کو اس طریقہ پر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا منشاء تو یہ ہے کہ حق دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فکرِ صحیح سے کام لے کر حق کو پہچان لیں وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھال کر باطل پرستوں کے مقابلہ میں اپنا اخلاقی تفوق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعہ میں سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین، اپنے بہتر اصولِ زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں۔ اور باطل کے خلاف پیہم جدوجہد کر کے فطری ارتقاء کی راہ سے اقامتِ دینِ حق کی منزل تک پہنچیں۔ اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا اور جس مرحلہ پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق بنائیں گے وہ مدد بھی انہیں دیتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ محض اپنی قدرتِ قاہرہ کے زور سے افکارِ فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکرِ صالح پھیلادے اور تمدنِ فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیتِ صالحہ تعمیر کر دے، تو ایسا ہرگز نہ ہوگا کیونکہ یہ اللہ کی اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اسے تصرف کے اختیارات دیے ہیں، طاعت و عصیان کی آزادی بخشی ہے، امتحان کی مہلت عطا کی ہے، اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لیے فیصلہ کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔

تمہیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے، کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کردو اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمہاری ذمہ داری و جواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں

باقی برصفحہ ۱۱۱ پر

مفکرِ اسلام سید مودودیؒ

حافظ محمد ادریس

سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ اس صدی کے عظیم ترین انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ ان کے دل میں اللہ اور اسکے رسولؐ کی سچی محبت، ملت اسلامیہ کا حقیقی درد اور پوری انسانیت سے خیر خواہی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کی شخصیت اتنی جامع اور ہمہ پہلو تھی کہ اس کا مطالعہ کرنے والے ایک ایک پہلو پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔

مجھے سید مودودیؒ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ علم کا ایک سمندر ہیں۔ جسکے کنارے معلوم نہیں اور جسکی گہرائی کا اندازہ مشکل ہے۔ جب اور قریبی تعلق قائم ہوا تو پتہ چلا کہ وہ ایک بلند و بالا، مضبوط پہاڑ ہیں جسے اسکی جگہ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا، عزیمت و استقامت کا یہ پہاڑ کسی طوفان اور سیلابِ بلا سے سرنہ ہوسکا۔ جب مزید قرب کا اعزاز حاصل ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ محبت کا ایک زمزمہ ہیں جسکی محبت کا چشمہ صافی کبھی گدلا نہیں ہوتا۔ میں نے سید مودودیؒ کو جس پہلو سے بھی دیکھا ان کی عظمت نے مجھے اپنا گرویدہ بنایا۔

میں سوچتا رہا کہ ان کی جرأت و بہادری میں کوئی ہم عصر ان کا ثانی نہیں۔ تو کیا جرأت و شجاعت ان کی امتیازی شان ہے؟ صبرو تحمل اور بردباری میں وہ یکتائے روز گار ہیں۔ تو کیا یہ صفت ان کی پہچان ہے؟ اسلام دشمنوں کے لیے وہ ننگی تلوار ہیں اور اس ضمن میں مداہنت ان کی لغت ہی میں نہیں۔ کیا اس وصف نے ان کو سارے معاصرین سے ممیز کر دیا ہے؟ ان کی زبان اردوئے معلّٰی اور ان کا قلم معجز بیان ہے تو کیا اس پہلو نے ان کو ممتاز بنا دیا ہے؟ ان کے کردار و گفتار، اخلاق و معاملات، علم و حلم، شجاعت و حکمت جس چیز کو دیکھتا ہوں دنگ ہی رہ

جاتا ہوں ۔ میرے خیال میں ان کی امتیازی شان ایک ہی تھی کہ وہ ہر معاملے میں اللہ کے بندے اور محمد عربیؐ کے مطیع فرمان تھے۔ اپنی تمام صلاحیتیں اور قابلیتیں ' جو ہر اور ہنر' فن اور کمال سب کو اس ایک کام کے لیے وقف کر دیا تھا کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا کلمہ سربلند ہو اور بندگانِ خدا سوائے خدا کے کسی کے سامنے سرنگوں نہ ہوں۔

سید مودودیؒ نے دین حق کو اجاگر کرنے کے لیے وہ اصطلاحات استعمال کیں جو نئی تو نہیں تھیں مگر بدقسمتی سے دنیا کے لیے اجنبی ہو چکی تھیں اور امتِ مسلمہ بھی انھیں ترک کر چکی تھی۔ انھوں نے شہادتِ حق کا فریضہ سرانجام دیا اور اس کے لیے اردو میں اسلامی لٹریچر کا ایک ایسا لازوال ذخیرہ چھوڑا جو آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ انھوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جو برصغیر ہی میں نہیں پوری دنیا میں سرگرم عمل ہے۔ ان کی کتابوں کے مشرق و مغرب کی ہر زبان میں ترجمے ہو رہے ہیں اور غیر مسلم ان سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر رہے ہیں جبکہ مسلمان ان کے فیضان سے حقیقی اسلام سے متعارف ہو کر شعوری طور پر اسلام کے مطابق زندگیاں ڈھال رہے ہیں۔ ان کا لٹریچر بھی صدقہ جاریہ ہے اور ان کی تحریک بھی۔

سید مودودیؒ کو ان کے لٹریچر کے آئینے میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کس قدر نوازا تھا۔ بدقسمتی سے ان کے مخالفین نے مخالفت میں زمین آسمان کے قلابے تو ملا دیے مگر ان کی تحریروں کو نہ خود پڑھا نہ اپنے متوسلین کو پڑھنے دیا۔ ان پر لگائے جانے والے الزامات اسقدر سطحی ' بودے ' لغو اور لچر ہیں کہ انسان انھیں پڑھ سن کر حیران رہ جاتا ہے۔ سید مودودیؒ کے عقیدت مندوں میں بھی ایک تعداد ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ان کی تحریریں یا تو بالکل نہیں پڑھیں یا کہیں کہیں سے جزوی حصے بے توجہی سے دیکھے ہیں ۔ ایسے لوگ ساری عقیدت و محبت کے باوجود حقیقی مودودیؒ کو نہیں پہچان سکتے ۔ مودودیؒ سے تعارف تو ان کی تحریروں ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔

سید مودودیؒ نے ۲۳ سال کی عمر میں اپنی ضخیم کتاب "الجہاد فی الاسلام" لکھی ۔ اس موضوع پر موجودہ دور میں کسی بھی زبان میں اس پائے کی کتاب نہیں لکھی گئی۔ جنگوں کے فلسفے اور تاریخ کو مستند حوالوں سے ہر قوم کے اپنے مآخذ سے بیان کیا گیا ہے ' اسلام پر لگائے جانے والے الزامات کا مسکت اور منہ توڑ جواب دیا ہے اور قتال فی سبیل اللہ کو نہایت دل نشین اور مدلل انداز میں دیگر جنگوں سے ممیز و ممتاز کر کے پیش کیا ہے ۔ اگر سید مودودیؒ نے صرف یہی ایک کتاب لکھی ہوتی تو بھی بطور مصنف و محقق ان کا نام زندۂ جاوید رہتا۔

"رسالہ دینیات" اسلام کا ایسا عام فہم، سلیس اور جامع تعارف ہے کہ ہر مسلم اور غیر مسلم اس سے یکساں استفادہ کر سکتا ہے۔ یہ کتاب اب تک دنیا کی چالیس سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔

"خطبات" کے ذریعے اسلام کے بنیادی عقائد و ارکان کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ اسلام محض ایک جامد نظریہ یا عقیدہ نہیں بلکہ ایک متحرک، زندہ و پائندہ نظامِ زندگی کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اس کے جملہ احکام کی حکمتیں واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں۔ "خطبات" پڑھ لینے کے بعد نماز محض چند حرکات و سکنات کا نام نہیں ہوتا بلکہ بندے کا اپنے آقا کے سامنے پورے فہم و شعور کے ساتھ حاضر ہونے کا احساس اسے اس نماز سے متعارف کراتا ہے جس میں سب فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ یہ تقرب اور براہ راست تعلق ہی تو نماز کی حقیقی روح ہے اور اسی سے دل کو سکون و قرار ملتا ہے۔

روزہ محض بھوک پیاس نہیں بلکہ عشق الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ چٹی نہیں بلکہ عبادت کا روپ دھار لیتی ہے اور اسکے ادا کرنے میں ایک گونہ طمانیت اور روحانی لذت حاصل ہوتی ہے۔ حج محض سیر و سفر اور زیارت نہیں بلکہ اپنے مالک سے ملاقات اور اسکی عظمت کے ادراک سے مالا مال کر دیتا ہے۔ جہاد محض خون ریزی نہیں بلکہ رضائے الٰہی کا حصول اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لیے سب کچھ نچھاور کر دینے کے جذبے، عزم اور نیت کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

مغربی تہذیب کی یلغار کے سامنے امتِ مسلمہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ مغرب کی نقالی اور ان کے کلچر و ثقافت سے مرعوبیت کا روگ ہر طبقے کو گھائل کر چکا تھا کہ سید مودودیؒ میدان میں اترے ۔ مردانہ وار یہ جنگ لڑی اور اس کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے جذبات بھڑکانے کی بجائے منطق اور دلیل اور اعداد و شمار کی زبان میں بات کی اور اپنے اچھوتے انداز بیان اور بے پناہ زور قلم کی مدد سے مغرب اور اسکی جھوٹی اقدار کا طلسم توڑ کے رکھ دیا۔ سید مودودیؒ نے مغرب کو اس کی اپنی تہذیب کی تباہ کاریوں کا جو آئینہ دکھایا ہے اس میں اس کا بھیانک چہرہ اور گھناؤنا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ "پردہ" ہو یا "اسلام اور ضبطِ ولادت" ہر جگہ اسلام مغرب پر حاوی اور غالب نظر آتا ہے۔ مغربی دنیا کے اپنے مہیا کردہ کوائف اور اعداد و شمار ان کے منہ پر جس طرح سید مودودیؒ نے دے مارے ہیں وہ انہی کا حصہ تھا۔

فقہی مسائل سے لیکر موجودہ سائنسی دور کے پیچیدہ مسائل تک ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور

اسلام کو اسکی حقیقی روح کے ساتھ نکھار کر لوگوں کے سامنے پیش فرمایا ۔ "رسائل و مسائل" صدیوں تک انسانی معاشرے میں پیش آمدہ مسائل کے لیے رہنمائی کا کام کرتی رہے گی ۔ یہاں یہ امر بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مرشد مودودیؒ کے شاگرد رشید اور ہمارے دور کے مایہ ناز محقق اور عالم جسٹس (ریٹائرڈ) مولانا ملک غلام علی صاحب نے اس سلسلہ کو جس کامیابی اور حسن و خوبی کے ساتھ جاری رکھا ہے' وہ قابلِ اطمینان بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی ۔

"تجدید و احیائے دین" اور "خلافت و ملوکیت" مولانا مرحومؒ کی وہ شہرہ آفاق اور تحقیقی کتب ہیں جن پر بے محابا تنقید اور شور و غوغا سننے میں آیا۔ تنقید کا بلاشبہ ہر شخص کو حق ہے مگر نقد و نظر کے علمی اصولوں اور اسلامی اخلاقی حدود کو لوگوں نے کم ہی ملحوظ رکھا ہے۔ جن عبارتوں پر مخالفت کا طومار باندھا گیا' مخالفین کے اکابر کی عبارتوں سے ان کا موازنہ کیا گیا تو عقل دنگ رہ گئی کہ ناقدین کس بنیاد پر تنقید کر رہے ہیں۔ مختلف شخصیات کیلئے نقد و نظر کے پیمانے بھی اگر بدل جائیں تو پھر علم و حکمت کے موتیوں کی قدر کیا رہ جائیگی؟

دونوں کتابیں اپنے موضوعات پر بہت اہم دستاویزات ہیں اور مولانا مودودیؒ نے تاریخ کا ایسا مؤثر تجزیہ کیا ہے کہ ایک جانب اسلام کی حقانیت اور دائمی صداقت کھل کر سامنے آتی ہے اور دوسری جانب یہ حقیقت بھی واشگاف ہو جاتی ہے کہ انسانی عظمت و رفعت کے باوجود انبیاء کرام کے علاوہ دیگر انسان معصوم نہیں ہوتے۔ آنے والے محققین اسی نظر سے سیّد مودودیؒ کی کاوشوں کا بھی تجزیہ کریں گے اور انھیں ان کے کام میں جہاں صواب نظر آئے گا وہاں خطا بھی بعید ازامکان نہیں۔ مودودیؒ بھی ہماری طرح ایک انسان تھے۔ تجدید و احیائے دین کا کام اللہ نے ان سے لیا۔ انسانی اور بشری تقاضوں سے ان سے بھی سہو و نسیان اور غلطی و خطا ہوئی ہوگی۔ اسکی علمی انداز میں نشان دہی نہ کوئی جرم ہے نہ اس پر کسی کو اعتراض ہوگا۔ ہاں البتہ الزام و اتہام اور علمی دلیل کے ساتھ غلطی کی نشاندہی میں جو فرق ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

سیّدؒ نے جس طرح مغربی تہذیب کو للکارا' اسی طرح ہر باطل نظریے اور جھوٹے دین کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ بیک وقت کئی کئی محاذ کھلے اور اس بندۂ خدا نے ہمت نہیں ہاری۔ چومکھی لڑائی لڑی اور ہر میدان میں ایک مجاہد کی حیثیت سے اپنے قلم و زبان کے جوہر دکھائے۔ انگریزوں کی کاشتہ جھوٹی نبوّت پر بلاشبہ مسلم علماء نے کاری ضربیں لگائیں۔ ان سب لوگوں کی تمام کاوشیں قابل صد مبارک باد ہیں۔ اس موضوع پر سیّد مودودیؒ نے "عقیدۂ ختمِ نبوت" اور "مسئلہ قادیانیت" لکھ کر جو خدمت سرانجام دی ہے اس کا کوئی جواب نہیں ۔ اسی موضوع پر

سید مودودیؒ کو فاتح تختہ دار کا اعزاز ملا۔ "قادیانی مسئلہ" محض ایک تاریخی کتاب ہی نہیں بلکہ تاریخ ساز کتاب ہے۔ "مسئلہ ختم نبوت" ایسا کتابچہ ہے جس نے قادیانیوں کی صفوں میں تہلکہ مچا دیا۔

مجھے ایک قادیانی مشنری نیروبی میں ملا۔ کئی دنوں کی بحث کے دوران میں ایک روز اسکی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے "اس ظالم (مودودی رحمتہ اللہ علیہ) نے ہمارے خلاف یہ کتابچہ لکھ کر ہمیں جو زک پہنچائی ہے' وہ بڑی بڑی کتابوں اور اشتعال انگیز کانفرنسوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے"۔ واضح رہے کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نے "ختم نبوت" انگریزی' سواحلی اور دیگر مقامی زبانوں میں ترجمہ کروا کے مشرقی افریقہ میں خصوصاً اور پورے براعظم میں عموماً پھیلا دیا تھا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کتابچے نے افریقہ میں معجزانہ طور پر قادیانیت کی بیخ کنی کر دی۔

سید مودودیؒ نے کیمونسٹ' دھریے' ملحد و منحرفین' لادین اور مغرب زدہ عناصر سب کا تعاقب کیا۔ سید مودودیؒ کی اس چومکھی لڑائی کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ چوبیس گھنٹے میں وہ کس طرح اتنے سارے کاموں سے عہدہ برا ہوتے تھے۔ جماعت کی تنظیم اور اس کے تقاضے' برادر تنظیموں کے معاملات اور ان کی راہ نمائی' عالمی اسلامی تحریکوں سے روابط اور حالات سے واقفیت' بے شمار مہمانوں کی آمد اور ان سے ملاقاتیں' تحریکی رسالوں میں مضامین اور معاندانہ اخباری بیانات کے جوابات' لا تعداد خطوط و استفسارات اور ان کے جواب میں مکتوبات' تحقیقی و علمی کام اور اس کیلئے مطالعہ اور حوالہ جات' بے شمار صحافیوں کے انٹرویوز اور سوالات۔ ایک جان ناتواں اور اس کے ساتھ بہت سے امراض کی یلغار اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ آئے دن حکومتِ وقت کی انتقامی کارروائیاں' جیل کی کوٹھڑی اور زنداں کی دیوار' یہ سب جاری تھا مگر سیدؒ کی فکر کے سوتے رواں دواں رہے۔ اور ان کا قلم نور کی شمعیں فروزاں کرنے کیلئے ہر لمحے مستعد اور تیار رہا۔ نہ مایوسی نہ اضمحلال! ایک جذبِ دروں تھا کہ روزافزوں رہا تا آنکہ اللہ کا بندہ اپنے اللہ سے جا ملا۔

سید مودودی رحمتہ اللہ علیہ راتوں کو نماز عشاء کے بعد جو قلم سنبھالتا تو پھر صبح کی اذان تک اسی جہاد میں مصروف رہتا۔ ستاروں کے قافلے ایک مدت تک اسے راتوں کو جاگ جاگ کر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ ادا کرنے میں منہمک دیکھتے رہے۔ کئی بار ہم نے انھیں فرماتے سنا "میں نے اپنے سارے جسم کو اتنی مشقت میں ڈالا ہے کہ اب ایک ایک عضو مجھ

سے انتقام لے رہا ہے"۔ جن دنوں میں ڈاکٹروں نے مطالعے سے مکمل طور پر منع کر رکھا تھا مجھے ان دنوں میں بھی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ فرمایا کرتے تھے "ان لوگوں کو کیا علم ہے کہ انسان کیلئے مطالعہ کس قدر ضروری ہے' میرا اگر بس چلے تو میں اپنی قبر میں بھی اینٹوں کی جگہ کتابیں چنواؤں"۔

عرض کر رہا تھا کہ سید مودودیؒ نے چوتھی لڑائی لڑی۔ منکرینِ حدیث کے مقابلے پر علماء نے بند باندھنے کی قابلِ قدر کوششیں کیں مگر حکومت کی سرپرستی میں فتنہ انکار حدیث مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ جب سید مودودی رحمتہ اللہ علیہ اس میدان میں اترے تو انھوں نے اپنی روایات کے عین مطابق نہایت ٹھنڈے دل سے منکرینِ حدیث کے رکیک حملوں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ایک ایک کر کے ان کے اعتراضات کا جواب دیا اور ان کی عقلیت پرستی اور منطق کو اس انداز میں چیلنج کیا کہ وہ لوگ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے نظر آتے لگے۔ وہ بہت کچھ تلملائے' جھنجھلائے' اشتعال میں آئے' بازاری حربے استعمال کیے مگر سیدؒ کی پکڑ اتنی مضبوط تھی اور اس کے دلائل و براہین اتنے قاطع کہ بھاگنے کی کوئی جگہ ملی نہ سر چھپانے کیلئے کوئی پناہ۔

سید مودودیؒ کی تمام کتابوں کو میں نہایت قدر اور عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں مگر ان کی معرکتہ الاراء کتاب "سنت کی آئینی حیثیت" میرے نزدیک اس اہم موضوع پر اتنی وقیع کتاب ہے کہ صدیوں میں کبھی ایسی کوئی کتاب منصۂ شہود پر آتی ہے۔ بہت سے گمراہ لوگ اس کتاب کی برکت اور نور سے راہ ہدایت پانے میں کامیاب ہوئے۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ بدقسمتی سے دورِ انحطاط میں مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ اسلام اس دور کے مسائل حل نہیں کر سکتا۔ سید مودودیؒ نے اس واہمہ کو بھی پاش پاش کر دیا۔ بہت سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان خلوصِ نیت سے یہ سمجھتے تھے کہ قرآن ایک مقدس مذہبی کتاب تو ہے مگر ایک جدید ریاست کیلئے دستور و قانون کے تقاضے پورے نہیں کرتی' معروف قانون دان اور صوفی منش سکالر اے ۔ کے ۔ بروہی مرحوم بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھے۔ مرحوم نے تو یہاں تک اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ قرآن میں دورِ جدید کے لیے دستوری دفعات موجود ہیں تو میں اسے پانچ ہزار روپے انعام دوں گا۔ سید مودودیؒ نے "اسلامی ریاست" لکھ کر اس موضوع کا حق ادا کیا۔ بروہی صاحب ایسے قائل ہوئے کہ پھر زندگی بھر اپنے آپ کو سیدؒ کا مرید اور شاگرد سمجھتے رہے۔

"تفہیمات" اور "تنقیحات" کے مضامین جس طرح عقدے کھولتے چلے جاتے ہیں وہ ہر قاری خود محسوس کر سکتا ہے۔ "سود" میں جس جرأت مندانہ طریقے سے ہر قسم کی مداہنت کا انکار کرتے ہوئے اسلام کا اقتصادی نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اسے ہر غیر جانبدار شخص بنظر تحسین دیکھتا ہے، مگر بدقسمتی سے بعض دینی شخصیات اس موضوع پر اختلافی رائے رکھتی تھیں جن کے پیروکاروں نے آج تک سیدؒ کو معاف نہیں کیا۔ "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" اپنے موضوع پر ایسی علمی کتاب ہے کہ کئی جامعات کے ایم اے کے نصاب میں تجویز کی گئی جملہ کتب کے درمیان نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے۔ عمرانیات کے اساتذہ اور طلباء اس کی علمی قدر و قیمت کو سلام اور خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس خشک موضوع کو جس خوبصورتی سے سیدؒ نے نبھایا ہے وہ دماغ کے ساتھ ساتھ دل کو بھی متاثر کرتا ہے۔ "سیرت سرورِ عالمؐ" اگر مکمل ہو جاتی تو خیرالبشر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح کے مجموعوں میں اس کا مقام بہت نمایاں ہوتا۔ "یہودیت و نصرانیت" ان دوالہامی مذاہب کے اوپر دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیدؒ کی کتابوں کا احاطہ کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ سیدؒ کے قلمی جہاد کا شاہکار ان کی تفسیر "تفہیم القرآن" ہے۔ راقم کو عربی اور اردو کی تفاسیر میں سے کئی ایک کو دیکھنے کا شرف حاصل ہے۔ میری ناقص رائے میں تمام مطبوعہ تفاسیر کے درمیان اپنی جامعیت کے لحاظ سے تفہیم منفرد ہے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ تمام مفسرین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق علومِ قرآنی کی بڑی خدمت کی ہے۔ ہر مفسر نے اپنی طبیعت اور میلان کے رنگ میں بعض خاص پہلوؤں کو زیادہ توجہ اور انہماک کے ساتھ اجاگر کیا ہے اور بڑے ہی قیمتی لعل و جواہر سینۂ قرطاس پہ پھیلا دیے ہیں جن کو دیکھ کر انسان جھوم اٹھتا ہے۔ سید مودودیؒ نے اپنی تفسیر میں کسی ایک پہلو کو اجاگر کرنے کی بجائے اسلام کی جامعیت کو ملحوظ رکھا ہے۔ ابن کثیرؒ، ابن جریرؒ، ابن الجوزی اور قرطبی کی طرح احادیث کے حوالے اور اہم تاریخی واقعات کو بھی قلمبند کردیا ہے اور موقع کی مناسبت کے مطابق جہاں ضرورت محسوس کی ہے، وہاں زمخشری اور بیضاوی کی طرح الفاظ کی تشریح بھی کردی ہے۔ علامہ محمود آلوسی اور امام رازیؒ کی طرح بڑی سے بڑی شخصیات سے دلائل کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے مگر شیخ محمد عبدہٗ اور رشید رضا کی طرح بلا دلیل محض ذاتی میلان سے کچھ نہیں لکھا۔ اسلام کی معاشرت اور معیشت، عسکریت اور نظام قانون، روحانیت اور مادی ضروریات واحتیاج کی جامع تصویر کشی تفہیم کے صفحات میں نظر آتی

ہے۔ معاصرین میں دیگر مفسرین کا بھی بڑا بلند پایہ ہے۔ سید قطب شہیدؒ کی "فی ظلال القرآن" ہو یا مولانا مفتی محمد شفیع کی "معارف القرآن" مولانا ابوالکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" ہو یا شیخ الہند محمود الحسن کا ترجمہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے تفسیری حاشیے ہوں سعید حویٰ کی "الاساس فی التفسیر" ہو یا مولانا امین احسن اصلاحی کی "تدبر قرآن" ہر ایک کا اپنا اپنا رنگ ہے اور تشنگانِ علم کے لیے سبھی چشمہ آب حیات کی حیثیت رکھتی ہیں، تاہم تفہیم کا ان ساری تفسیروں کے درمیان اپنا ایک امتیازی انداز اور اچھوتا طرزِ بیان ہے۔ تفہیم کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ خالق کا پیغام ہے، اپنے بندوں کے نام، جس میں اس نے قیامت تک انسان کو زندگی گزارنے کا جامع اور ابدی طریقہ نہایت آسان پیرائے میں سکھا دیا ہے۔

سید مودودی رحمتہ اللہ علیہ اپنے تفسیری حاشیے میں قاری کو ذہنی اور قلبی طور پر اپنے ساتھ لیکر چلتے ہیں۔ کوئی بہت بڑا عالم اور فلسفی ہو یا معمولی پڑھا لکھا دیہاتی، ہر ایک اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق اپنا دامن موتیوں سے بھر سکتا ہے اور کسی کو بھی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ سید مودودیؒ نے تفہیم کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے جو اصول بیان کر دیے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ تفہیم سے متعارف ہو جانے والا قاری پھر زندگی بھر اس سے بچھڑنا گوارا نہیں کرتا۔ ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں جنہوں نے بیسیوں مرتبہ تفہیم القرآن کو بالاستیعاب اوّل سے آخر تک پڑھا ہے۔

اس مضمون میں سید مرحومؒ کی تمام کتابوں کا احاطہ ممکن بھی نہیں اور مقصود بھی نہیں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" "اسلامی نظام زندگی" "انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" "اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر" "سلامتی کا راستہ" "شہادت حق" "نشری تقریریں" اور دیگر چھوٹے چھوٹے کتابچے اتنے اہم، ایمان افروز اور معلومات افزا ہیں کہ ہر ایک کا اپنا مقام ہے۔ ان سب کا یہ حق ہے کہ ہر ایک پر الگ مقالہ لکھا جائے۔

ہم عصر اسلامی تحریکیں "اخوان المسلمون" اور اس سے نکلنے والی مختلف تنظیمیں "نورسی تحریک" اور اس کے متاثرین، افریقہ، یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کی اصلاحی اور اسلامی تحریکات، سب سید مودودیؒ کی فکر سے متاثر ہیں اور ان کی کتب کی خوشہ چین!

سید مودودیؒ سے لوگ محض ان کے علم ہی سے متاثر نہیں ہیں بلکہ ان کی حکمت نے بھی سب کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ منہ زور طوفانوں کے درمیان بہادری سے قیادت کا حق ادا کیا اور حکمت و دانش سے تحریک کو دشمن کی سازشوں سے محفوظ رکھا۔ یہ ان کی جامع شخصیت کی بہت

بڑی دلیل ہے۔

سید مودودی رحمتہ اللہ علیہ کی برپا کی ہوئی (تحریک) "جماعتِ اسلامی" کے نام سے پاکستان، ہند، بنگلہ دیش، سری لنکا، مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر میں سرگرم عمل ہے۔ ان تمام خطوں میں حالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس لیے اپنے اپنے حالات کے مطابق غلبۂ اسلام کے لئے جماعتِ اسلامی کے لوگ ہر جگہ جدوجہد میں معروف ہیں۔

جماعت کے قائم کردہ بہت سے دعوتی و تبلیغی ادارے امریکہ، یورپ اور افریقہ میں مختلف ناموں سے اسلام کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ جہادِ افغانستان میں شریک مختلف تنظیمیں بھی سید مودودیؒ کی فکر سے براہ راست متاثر ہیں اگرچہ وہ مختلف ناموں سے معروف و متعارف ہیں۔

جماعتِ اسلامی کو قائم ہوئے نصف صدی بیت گئی ہے۔ جماعت کا کام خاصا پھیل چکا ہے۔ اسکی پچاس سالہ تقریبات ملک اور بیرون ملک منعقد ہو رہی ہیں۔ ان تقریبات کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں، دیکھیں کہ ہم نے کیا کچھ حاصل کیا ہے اور کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ آئندہ کون سی مشکلات پیش آنے والی ہیں اور ان سے عہدہ برا ہونے کی کیا کیا صورتیں ممکن ہوں گی ۔ جماعت میں پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ کچھ مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں جو ایک فطری بات ہے۔ ان مسائل کو دیکھ کر گھبرا اٹھنا اور بددل ہوجانا تحریکی فکر کے خلاف ہے اور ان سے آنکھیں بند کرلینا خودکشی کے مترادف۔

سید مودودیؒ کی زندگی میں بھی جماعت میں وسعت اور پھیلاؤ سرعت اور تسلسل کے ساتھ جاری تھا۔ مسائل بھی پیدا ہوتے تھے اور ان کا حل بھی سوچا جاتا تھا۔ بعض ساتھی بیرونی یا اندرونی مسائل و مشکلات اور شکوہ و شکایات کی وجہ سے الگ بھی ہوتے رہے ہیں مگر قافلہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہا۔ سید مودودیؒ نے جہاں اپنی کتب کی صورت میں ایک بے بہا دولت امت کے لیے چھوڑی ہے وہیں انھوں نے جماعت کو بھی مسلم معاشرے کی اصلاح کیلئے مضبوط بنیادوں پر قائم کیا اور اسے ایسی روایات دیں جو جماعتی زندگی کیلئے نمو اور ارتقاء کی ضامن ہیں۔ مخصوص معاملات میں بلا توقف سرِ تسلیم خم اور تدبیرو تطبیق کے معاملات میں غور و فکر اور منصوبہ بندی ۔ جماعت کو چلانے کیلئے اطاعت فی المعروف کا اصول اور شورائیت و احتساب کا اہتمام ۔ الحمدللہ یہ سب روایات قائم ہیں اور ان پر عمل درآمد جماعت کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔

آج کے دور میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں فیصلے کرنے کیلئے سرعت بھی ضروری

ہے اور احتیاط بھی۔

سید مودودیؒ نے جس انداز میں اپنے ساتھیوں کی تربیت کی تھی اس میں ان دونوں امور کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ ایک مخصوص مزاج اس تربیت کے نتیجے میں تشکیل پا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک اور بیرون ملک پھیلے ہوئے جملہ کارکنان کسی ایک موضوع پر تقریباً یکساں سوچ رکھتے تھے اور اس پر ان کے بیانات میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی تھی۔ آج بھی کارکن کے اندر یہ جوہر پیدا ہو سکتا ہے مگر اس کے لیے سیدؒ کے چھوڑے ہوئے علمی ورثے کی طرف رجوع کی ضرورت ہے۔ ہمارے لوگوں میں اب مطالعے کا شوق کافی حد تک کم ہو گیا ہے۔ پچاس سالہ تقریبات کے پیغامات میں سے ایک پیغام یہ بھی ہونا چاہیے کہ کارکن کا کتاب سے رشتہ جڑ جائے۔ اسی سے یقین کی دولت ملے گی، اسی سے خودی پروان چڑھے گی، اسی سے دل و نگاہ مسلمان ہوں گے اور اسی سے منزل کا سراغ ملے گا۔

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

"تاریخ جماعتِ اسلامی" حصہ دوم، باب اوّل

تاسیس و قیامِ جماعت

قسط (۲)

آباد شاہ پوری

افتتاحی خطاب

تاریخ ساز لمحات آپہنچے تھے۔ اجلاس کا افتتاح سید مودودیؒ کے خطاب سے ہوا۔ یہ ایک طویل اور اہم خطاب تھا۔ ابتدا میں سید صاحبؒ نے اپنے ذہنی سفر کی روداد بیان کی اور ان حالات پر تبصرہ کیا جن کے نتیجے میں وہ مختلف مراحل سے گزر کر ان تاریخ ساز لمحات تک پہنچے تھے۔ اس روداد میں پچھلے نو برس کی طویل تاریخ اور وہ سارا دعوتی پس منظر سمٹ آیا تھا۔ جس میں جماعت اسلامی وجود میں آرہی تھی۔ یہ پس منظر محض ایک فرد کے داخلی اور عملی تجربات و مشاہدات ہی بیان نہیں کرتا تھا بلکہ یہ بھی بتاتا تھا کہ جب ایک شخص کے فکر و نظر میں انقلاب آتا ہے اور وہ شعوری طور پر اسلام و ایمان لاتا ہے تو یہ شعوری اسلام و ایمان اس کو اپنی ذات تک محدود کر کے نہیں رکھ دیتا، ایمان و اسلام کے تقاضے اس کو مضطرب اور بے چین کر دیتے ہیں، یہ ایمان و اسلام ایک مسلمان پر جو فرض عائد کرتا ہے۔ اس کی ادائیگی کی فکر اسے ہر آن آمادۂ عمل رکھتی ہے، یہ خواہش اسے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی کہ جس حق پر وہ ایمان لایا ہے اس حق کو اپنے گردوپیش کی دنیا میں پھیلائے۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے اس حق کو ایک تحریک کی صورت دینے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ رسالہ ترجمان القرآن جاری کیا، الجھنوں کو صاف کرنے کی جدوجہد کی، ادارۂ دارالاسلام قائم کیا، لٹریچر کے ذریعے اس مقصد کی طرف شب و روز دعوت دیتے اور ذہنوں کو ہموار کرتے رہے، ایک ایک کر کے رفقاء کی تعداد بڑھتی رہی، ملک کے مختلف حصوں میں ہم خیال لوگ تیار ہوتے رہے اور بعض مقامات پر چھوٹے چھوٹے حلقے بھی وجود میں آگئے۔ اس ساری روداد کو بیان کرنے کے بعد سید صاحبؒ نے فرمایا اب جماعت اسلامی کی تاسیس اور تحریکِ اسلامی کو منظم طور پر اٹھانے کے لیے زمین تیار ہو چکی ہے اور دوسرا قدم

اٹھانے کے لیے موزوں ترین وقت آگیا ہے۔ ۲۳۔

مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے ہوتے ہوئے نئی جماعت کی ضرورت

اس کے بعد سید صاحبؒ نے مجوزہ نئی جماعت کے متعلق مختلف بنیادی امور کی وضاحت کی اور ملک میں مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے موجود ہوتے ہوئے ایک نئی جماعت کی تاسیس و تشکیل کے اسباب بیان کیے اور ان جماعتوں اور مجوزہ اسلامی جماعت اور تحریک کے درمیان اصولی فرق کو واضح کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اب تک مسلمان جماعتیں یا تو اسلام کے کسی جزو کو لے کر اٹھی ہیں یا کسی ایسے دنیوی مقصد کو جس کا اسلام کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کی تنظیم دنیا کی غیر مسلم جماعتوں اور انجمنوں کے خطوط پر کی گئی ہے ان میں ہر قسم کے لوگ اس مفروضے پر بھرتی کر لیے گئے ہیں کہ وہ مسلمان قوم میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان جماعتوں کے عام ارکان کی صفوں ہی میں نہیں کارکنوں اور لیڈروں کی صفوں میں بھی ایسے لوگ داخل ہوگئے جن کی نہ سیرتیں اور کردار لائق اعتماد ہیں اور نہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی کے بارِ امانت کو اٹھانے کی اہلیت ہی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ پھر یہ جماعتیں صرف نسلی مسلمانوں تک محدود رہی ہیں، غیر مسلموں کے لیے ان کے اندر کوئی کشش اور جاذبیت نہیں بلکہ ان میں سے اکثر کی سرگرمیاں غیر مسلموں کے اسلام کی طرف آنے میں سدِّراہ بن گئی ہیں۔ اس کے برعکس ہم پورے کے پورے اور عین اسلام کو لے کر چل رہے ہیں، ہم ٹھیک وہ نظام جماعت اختیار کر رہے ہیں جو شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ جماعت کا تھا، ہمارے جماعتی ضوابط ایسے ہیں کہ مسلمانوں میں سے صرف صالح عنصر ہی آگے بڑھے گا جو کلمہ طیبہ کے معانی و مفہوم اور مقتضیات کو جان کے اس پر شعوری ایمان لانے کا اقرار کرے۔ جماعت میں رہنے کے لیے یہ شرط لازم ہے کہ اسلام میں جو کم سے کم مقتضیاتِ ایمان ہیں ان کو پورا کرے، ہم نے جماعت کی دعوت ملک کے اندر یا عالم اسلام کے محض پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھی بلکہ اس کا خطاب تمام روئے زمین پر بسنے والی سعید روحوں سے عام ہے۔ ۲۴۔

پھر سید مودودیؒ نے نئی جماعت کا نام جماعت اسلامی رکھنے کی وجہ بتائی اور فرمایا:

جب جماعت کا عقیدہ، نصب العین، نظامِ جماعت اور طریقِ کار بلا کسی کمی بیشی کے، وہی ہے جو اسلام کا ہمیشہ رہا ہے تو اس کے لیے اسلامی جماعت کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں ہوسکتا اور جب یہ عین اسلام کے نصب العین

کی طرف اسلامی طریق ہی پر حرکت کرتی ہے تو اس کی تحریک ' تحریک
اسلامی کے سوا کچھ نہیں ہے ۲۵۔

دو زبردست خطرات

پھر سیّد صاحبؒ نے ان دو زبردست خطرات سے متنبہ کیا جن سے دور نبوت کے بعد اسلام کا کام کرنے والی اکثر جماعتیں دو چار ہوتی رہی ہیں۔

ایک یہ کہ وہ اپنے آپ کو وہی حیثیت دینے لگتی ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں اسلامی جماعت کی تھی۔ وہ اسلام و ایمان کو صرف اپنے اندر حصر کرلیتے ہیں' ان کے نزدیک جو شخص ان کی جماعت میں نہیں وہ مومن نہیں ہے اور **من شذ شذ فی النار**۔ (جو شخص جماعت سے الگ ہوا وہ آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ حدیث) یہ غلط فہمی اس جماعت کو مسلمانوں کا ایک فرقہ بنا کر رکھ دیتی ہے اور پھر اس کا سارا وقت اصل کام کے بجائے دوسرے مسلمانوں سے الجھنے اور مناظرے کرنے میں کھپ جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ ایسی جماعتیں جس شخص کو اپنا امیر یا امام تسلیم کرتی ہیں اس کو وہی حیثیت دے دیتی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کی تھی' جس کی گردن میں اس امام کی بیعت کا قلادہ نہیں ہوتا اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتی ہیں' اس طرح اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر اپنی ساری تگ و دو اپنے امیر یا امام کی امارت و امامت کو منوانے پر مرکوز کر دیتی ہیں۔ سیّد صاحبؒ نے ان دونوں غلط فہمیوں سے بچ کر چلنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ ہماری حیثیت ' نبیؐ کی قیادت میں اٹھنے والی اسلامی جماعت کی سی نہیں ہے جو دنیا میں واحد اسلامی جماعت ہوتی ہے اور جس کے دائرے سے باہر صرف کفر ہی ہوتا ہے ' بلکہ ہماری حیثیت اس جماعت کی ہے جو اصل نظام جماعت کے درہم برہم ہوجانے کے بعد اس کو تازہ کرنے کے لیے اٹھتی ہے ' ایسی جماعتیں بیک وقت کئی ہوسکتی ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں اور ہمارا امیر ہی امیرالمومنین ہے۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمیں اس غلو سے پرہیز کرنا اور فرقہ بننے سے بچنا چاہیے۔ ۲۶۔

اسلامی تحریک کی ہمہ گیری

تیسری بات جو سیّد صاحبؒ نے اپنے خطاب میں فرمائی وہ جماعت اسلامی کے کام اور اس کے دائرہ عمل کے بارے میں تھی انہوں نے فرمایا کہ جماعت کے سامنے کوئی محدود کام نہیں ہے بلکہ یہ پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ اسلامی تحریک ایک ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے اور اس

کو ہر قسم کے اور ہر درجے کی صلاحیت والے افراد کی ضرورت ہے' البتہ یہ کام کوئی آسان اور ہلکا کام نہیں ہے' یہ بڑا مشکل اور کٹھن کام ہے۔ دنیا کے پورے نظام' اس کے اخلاق' تہذیب سیاست' تمدن' معیشت اور معاشرت ہر چیز کو بدلنے اور اس کی جگہ خدا کی اطاعت پر مبنی نظام قائم کرنے کا کام ہے۔ اس راہ پر قدم بڑھانے سے پہلے خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کس خار زار میں قدم رکھ رہے ہیں۔۲۷

جماعت کی تنظیم اور انتخابِ امیر

اس خطاب کا چوتھا اور آخری نکتہ جماعت کی تنظیم اور انتخابِ امیر سے تعلق رکھتا تھا۔ قیادت و سیادت کا مسئلہ مسلمانوں کے اندر ہمیشہ بڑا اہم اور نازک رہا ہے۔ اس مسئلے پر امت میں بڑے بڑے فتنے اٹھتے رہے ہیں جنھوں نے اسے نہ صرف جماعتی اور گروہی بنیادوں پر پھاڑ کے رکھ دیا بلکہ نظریاتی اور فکری اور عقیدہ کی بنیاد پر بھی مختلف گروہوں اور احزاب میں بانٹ دیا' جن کے درمیان ایک مرتبہ اختلافات پیدا ہوئے تو پھر یہ خلیج کبھی پٹنے نہ پائی۔ اسلامی نظامِ جماعت درہم برہم ہونے کے بعد قیادت کے مسئلے کا ایک پہلو ہمیشہ یہ رہا کہ کچھ لوگ امت پر بالا ہی بالا مسلّط ہوگئے اور ایک بار مسلّط ہوئے تو یہ قیادت گویا ان کے گھر کی باندی بن گئی' موت نے آلیا تو یہ باندی ورثے میں ان کی اولاد یا خاندان کے کسی فرد کو منتقل ہوگئی۔ قیادت کے اس المیہ کا آغاز کبھی کبھی استحقاق کے پردے میں ہوا' کسی شخص نے مسلمانوں کو کسی مقصد کے لیے پکارا' لوگ اس پکارنے والے کی آواز پر جمع ہوئے' اس کی قیادت میں انھوں نے جدّوجہد کی اور کامیابی کے مراحل طے کیے۔ پھر ان خدمات کے صلے میں قیادت اس کا اور اس کی آنے والی نسلوں کا موروثی حق بن گیا۔ سیّد صاحبؒ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس طرزِ عمل سے ہٹ کر راہ اختیار کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو ایک نظریہ کی طرف دعوت دی تھی اور پچھلے آٹھ نو برس سے انھیں پکار رہے تھے' مسلمان ہونے کی حیثیت سے زندگی کا جو مقصد مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا اسے پھر سے اجاگر کیا تھا' ان کے اندر احساسِ زیاں پیدا کیا تھا' ان کی تہذیبی فکر کو نکھارا اور ان کی الجھنوں کو سلجھایا تھا اور انھیں اسلام کے نصب العین کی طرف بڑھنے پر آمادہ کیا تھا۔ اب جبکہ جماعت قائم ہورہی تھی لوگوں کی نظریں انھیں کی طرف اٹھنی چاہییں تھیں' یہ ایک بالکل فطری عمل تھا۔ لیکن سیّد صاحبؒ نے اس فطری حقیقت و عمل سے بھی اپنے آپ کو الگ کرلیا۔ انھوں نے حاضرینِ اجتماع کو تنظیم کی صورت منظّم ہونے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا:

میرا کام آپ کو ایک جماعت بنا دینے کے بعد پورا ہو جاتا ہے۔ میں صرف ایک داعی تھا' بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور میری تمام مساعی کی غایت یہ تھی کہ ایک ایسا نظام جماعت بن جائے۔ جماعت بن جانے کے بعد میں آپ میں کا ایک فرد ہوں' اب یہ جماعت کا کام ہے کہ اپنے میں سے کسی اہل تر آدمی کو اپنا امیر منتخب کرے۔۔۔۔ میرے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ جب دعوت میں نے دی ہے تو آئندہ اس تحریک کی رہنمائی کو بھی اپنا ہی حق سمجھتا ہوں۔۔۔۔ نہ میں اس کا خواہشمند ہوں اور نہ اس نظریہ کا قائل کہ داعی کو ہی آخرکار لیڈر بھی ہونا چاہیے' نہ مجھے اپنے متعلق یہ گمان ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کا لیڈر بننے کی اہلیت مجھ میں ہے۔۔۔۔ لہٰذا اس مفروضے پر نہ چلیے کہ جس طرح تشکیل جماعت سے پہلے سارے کام میں اپنی ذمہ داری پر چلاتا رہا ہوں اسی طرح تشکیل جماعت کے بعد بھی میں ہی آپ سے آپ امارت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔ جماعت بن جانے کے بعد میری اب تک کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ آئندہ کے کام کی پوری ذمہ داری جماعت کی طرف منتقل ہوئی جاتی ہے اور جماعت اپنی طرف سے اس ذمہ داری کو جس کے بھی سپرد کرنے کا فیصلہ کرے اس کی اطاعت اور خیر خواہی اور اس کے ساتھ تعاون کرنا ہر فرد جماعت کی طرح میرا بھی فرض ہوگا۔ ۲۸۔

دستورِ جماعت کی منظوری

افتتاحی خطاب کے بعد سیّد مودودیؒ نے دستور کا مسودہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ مسودہ سیّد صاحبؒ نے خود تیار کیا تھا ۲۹۔ کچھ کاپیاں چھپوالی گئی تھیں اور تمام آنے والوں کو دے دی گئی تھیں تاکہ وہ اس پر غور کرلیں ۳۰۔ چودھری غلام محمد مرحوم "تاریخ جماعتِ اسلامی" کے قلمی مسودہ میں ایک کمیٹی کا ذکر کرتے ہیں ۳۱۔ ان کی روایت کے مطابق مسودہ پڑھتے وقت جو ترامیم و اختلافات سامنے آئے ان کے تصفیے کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی۔ اس کمیٹی نے ان ترامیم پر غور و فکر کر کے دستور کے مسودہ کو آخری شکل دی اور یہی مسودہ سیّد مودودیؒ نے منظوری کے لیے تاسیسی اجتماع میں ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء (۲ شعبان ۱۳۶۰ھ) کو پیش کیا۔ کمیٹی کے قیام کی روایت اور کہیں نہیں ملتی' روداد جماعت تک اس بارے میں خاموش ہے۔ اگر یہ روایت درست ہے(۳۱ الف) تو گویا سیّد صاحبؒ کے تحریر کردہ دستور کی نقول تقسیم کرنے کے بعد

شرکائے اجتماع سے ۲۵ اگست ہی کو اس میں ترمیم و اضافہ کی تجاویز لے لی گئی تھیں، جن کا جائزہ لے کر اس کمیٹی نے مسودہ کو آخری شکل دی جسے اگلے روز افتتاحی اجلاس میں پیش کیا گیا۔ بہرحال رودادِ جماعت کے مطابق اس دستور کا ایک ایک لفظ پڑھا گیا اور اس پر بحث ہوئی۔ ہر شخص کو اظہارِ رائے کا پورا پورا موقع دیا گیا۔ اجلاس دن بھر جاری رہا۔ درمیان میں صرف دوپہر کے کھانے اور ظہر اور عصر کی نمازوں کا وقفہ ہوا۔ مغرب کے قریب جا کر ہر مسئلے پر بحث مکمل ہوگئی اور دستور بعض ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ پورا کا پورا باتفاقِ کلّی منظور کر لیا گیا۔۳۲

جماعتی امور و معاملات اور سیّد مودودیؒ کا طریقِ عمل

دستور سازی کے اس عمل سے پتہ چلتا ہے کہ سیّد مودودیؒ جماعتی امور و معاملات کو کس انداز سے انجام دیا کرتے تھے۔ ان کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ من مانے فیصلے کرنے اور پالیسیاں وضع کرنے کے بجائے اپنے ساتھیوں کو اعتماد میں لے کر چلتے۔ ان کے نزدیک قیادت و سیادت، امارت و صدارت اور کسی بھی دوسرے منصب کے اختیارات سے زیادہ اہمیت تحریک کے کام کو حاصل تھی جسے ساتھیوں کی مکمل تائید اور انکے اعتماد کامل کے ساتھ کیا جاتا۔ سیّد صاحبؒ اپنے لکھے کو حرفِ آخر نہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے ادارہ دارالاسلام کا دستور العمل کامل چھ مہینے کے غوروخوض اور حالات کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا، پھر محض اپنی فکرونظر کی صلاحیتوں ہی پر انحصار نہیں کیا بلکہ اس سلسلے میں اپنے قریبی اصحاب سے بھی تبادلہ خیال کیا، پھر اس خاکہ کی کاپیاں تقریباً چالیس اصحاب علم وفضل کے پاس استصواب کے لیے بھیجیں۔ یہ حضرات وہ تھے جو دارالاسلام کی تجویز میں دلچسپی لے رہے تھے اور جن سے سیّد صاحبؒ ان کی اصابت رائے کی بنا پر استفادہ ضروری سمجھتے تھے۔ تقریباً یہی طرزِ عمل انھوں نے جماعت اسلامی کے دستور کے سلسلے میں اختیار کیا۔ پہلے اس پر اجتماع کے شرکاء سے ترامیم اور اضافے کی تجاویز طلب کیں۔ پھر ایک کمیٹی نے انھیں جانچا پرکھا اور دستور کا آخری مسودہ تیار کیا۔ پھر اجتماعِ عام میں اس کی ایک ایک شق پر خوب اچھی طرح بحث کی گئی اور جتنی بھی ترمیمیں اور اضافے ہوئے سب کے سب اتفاقِ رائے سے ہوئے۔ گویا سید صاحبؒ نے اس امر کا پورا پورا اہتمام کیا کہ جماعتی زندگی کے اولین مرحلے، دستور سازی ہی میں جماعت کی اساس رکھنے والے تمام اصحاب بھرپور طریقے سے شرکت کریں، دستور کسی فرد واحد کا ساختہ پرداختہ اور اس کی مرضیات کا آئینہ قرار نہ پائے بلکہ ہر شخص اس کام میں اپنے آپ کو شریک (Involve) سمجھے، اسے اپنا بنایا ہوا دستور سمجھے اور اس کو اس کے الفاظ اور روح دونوں کے ساتھ قبول کرے، اس میں متعین نصب العین تک

پہنچنے کی جدوجہد کو دل و دماغ کی ہم آہنگی کے ساتھ اپنائے اور دستور میں عائد کردہ ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی کو محض ضابطے کی پابندی نہ سمجھے بلکہ ایک ایسے عہدوپیمان کی تکمیل کا فرض گردانے جو اس نے اپنے اللہ کے ساتھ اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے باندھا ہے۔ یہی نہیں سید صاحبؒ نے جماعت کے باہر کے حلقوں کو بھی مطمئن کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ دستور جماعت کی بعض شقوں حتیٰ کہ عبارتوں اور الفاظ پر اعتراضات ہوئے تو سید صاحبؒ نے ان پر پوری توجہ دی ' جن شکوک و شبہات کی واقعی کوئی گنجائش تھی اور اعتراضات میں کوئی وزن تھا انھیں دستور میں ترامیم کے ذریعہ رفع کیا اور جو اعتراضات محض الفاظ کی تعبیر سے تعلق رکھتے تھے ان کے بارے میں بھی اپنے موقف کی وضاحت کرکے معترضین کو مطمئن کرنے کی سعی کی اور لکھا:

".......خود ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے تو انھیں محسوس ہوجائے گا کہ ان کے اعتراضات زیادہ تر تعبیرات پر ہیں نہ کہ نفس مدعا پر اور تعبیرات میں دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا قادر الکلام آدمی بھی شاید اتنا کامیاب نہیں کہ سب لوگ اس کے طرز تعبیر سے مطمئن ہوجائیں اور کسی کو کہیں سے گرفت کی گنجائش نہ ہو------ ۳۳۔

دستورِ جماعت کی نظریاتی بنیاد

یہ ایک رسمی (Formal) قسم کا اور تنظیمی نوعیت اور عہدہ و مناصب کے حصول کا طریق کار (procedure) متعین کرنے والا دنیوی دستور نہ تھا۔ سید مودودیؒ نے اس دستور کی مختلف امتیازی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے قیام جماعت کے بعد اگلے ہی ماہ تحریر فرمایا:

"اس دستور کی بنیاد جس خیال پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اسلام میں سے کسی ایک مقصد کو لے کر نہ اٹھیں۔ بلکہ اصل اسلام اور پورے اسلام کو لے کر اٹھیں۔ جس مقصد کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے وہی ہمارا مقصد ہو ' جس چیز کی طرف انھوں نے دعوت دی اسی کی طرف ہم دعوت دیں ' جس طرز پر وہ ایمان لانے والوں کی جماعت بناتے تھے اسی طرز پر ہم جماعت بنائیں جو نظامِ جماعت ان کا تھا وہی ہمارا ہو ' جن ضوابط کو وہ اپنی جماعت میں نافذ کرتے تھے انہی کو ہم بلا کسی کمی بیشی کے نافذ کریں اور جس طریقے سے وہ اپنے نصب العین کے لیے جدوجہد کرتے تھے اسی طریقے سے ہم جدوجہد

کریں۔"۳۴۹۔

اس طرح یہ دستور اپنی روح اور سراپا میں کلیۃ" ایک نظریاتی دستور تھا۔ اس کی ایک ایک دفعہ اور شق میں اسلامی نظریہ فکر و عمل بول رہا تھا۔ اس کی کوئی دفعہ مبہم نہ تھی۔ تقریباً ہر دفعہ کی تشریح کر دی گئی تھی۔ دستور کی بنیاد اور مرکز و محور **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عقیدہ تھا اور اسی کو جماعتِ اسلامی کا عقیدہ قرار دیا گیا تھا۔ توحیدِ خالص اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالتِ کامل و اکمل کے دو اجزاء پر مشتمل اس عقیدے کی تشریح میں وہ سارے امور سمٹ آئے تھے جنہیں اسلام اپنے ماننے والوں پر اعتقادی طور پر لازم قرار دیتا اور ان پر ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو استوار کرتا ہے۔ اس زندگی بخش عقیدہ کو عمل کے پیکر میں ڈھالنا اور اس کو سربلند کرنا' خالصاً" رضائے الٰہی کے لیے خدا کی زمین پر خدا کی حکومت ------ حکومت الٰہیہ ------ قائم کرنا جماعت اسلامی کا مقصد وجود اور نصب العین قرار پایا۔ دستور میں حکومت الٰہیہ کی تشریح بھی کی گئی تھی اور دنیا میں قائم دوسرے تمام نظام ہائے حیات کو مسترد کر دیا گیا تھا کہ یہ نظام اللہ کے خلاف صریح بغاوت پر مبنی تھے۔ دستور میں کہا گیا تھا کہ

> "مومن کا کام اس بغاوت کو دنیا سے مٹانا اور خدا کی زمین پر خدا کے سوا ہر ایک کی خداوندی ختم کر دینا ہے۔ مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کا قانونِ تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح خدا کا قانونِ شرعی بھی عالمِ انسانی میں نافذ ہو۔ مومن کی تمام مساعی کا ہدفِ مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے۔"

جماعت میں داخلہ کی بنیادی شرط اور اس کے تقاضے

جماعت کے دروازے قوم' نسل اور ملک کی کسی تمیز کے بغیر ہر اس مرد و زن پر کھلے تھے جو عقیدہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کو اس کے پورے معنی کے ساتھ سمجھ کر شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے۔ اس شرط کے سوا جماعت میں داخل ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی' البتہ ادائے شہادت کے تقاضوں کو پورا کرنا اور اپنی زندگی میں ان تغیرات کو لانا ضروری تھا' کچھ فوری طور پر اور کچھ تدریج کے ساتھ۔

☆ فوری تغیرات جو مطلوب تھے' حسب ذیل تھے:

فرائض کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادائیگی' کبائر سے اجتناب اور نادانستہ ارتکاب کی

صورت میں توبہ اور انابت الی اللہ ' معصیتِ فاحشہ کے ذیل میں آنے والے ذریعۂ معاش (مثلاً سود ' شراب ' زنا' رقص و سرود' شہادتِ زُور ' رشوت ' خیانت ' قمار اور قتال فی غیر سبیل اللہ) کو بھاری سے بھاری نقصان کی پروا کیے بغیر ترک کر دینا' حرام طریقے سے حاصل کردہ جائداد سے دست کشی اور اہلِ حقوق کے سلب کردہ حق کی ادائیگی ' حاکمیتِ اعلیٰ (Sovereignty) کی مدعی حکومت کے اعلیٰ و ادنیٰ مناصب سے دستبرداری اور اس کی قانون ساز مجالس اور انتظامی کونسلوں کی رکنیت سے علیحدگی ' غیر الٰہی نظام حکومت کے دیے ہوئے خطابات کو واپس کرنا اور ان وفاداریوں اور نیازمندیوں سے باز آجانا جن کی بدولت یہ خطابات عطا ہوئے یا اب نباہنا پڑ رہا ہے۔

دستور میں قرار دیا گیا تھا کہ ادائے شہادت کے بعد کسی شخص کی زندگی میں اگر یہ تغیرات رونما نہیں ہوں گے تو اسے جماعت میں نہیں لیا جائے گا اور اگر لیا جاچکا ہوگا تو اسے خارج کر دیا جائے گا۔

☆ وہ تغیرات جو ایک شخص کو اپنی زندگی میں بتدریج لانے تھے' ان کا دائرہ بڑا وسیع تھا اور یہ فکری و عملی' دینی ' اخلاقی ' معاشرتی اور معاملاتِ زندگی کے تمام گوشوں میں مطلوب تھے۔ مثلاً دین کا کم سے کم اتنا علم حاصل کرنا کہ وہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز اور فرق کر سکیں۔ تمام معاملات زندگی میں نقطہ نظر' طرزِخیال اور عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنا اور اپنی پسند و ناپسند کے معیار اور وفاداریوں کے محور کو رضائے الٰہی کے تابع کرنا ' رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو صاف کرنا' نفسانیت یا دنیا پرستی پر مبنی تعصبات ' دلچسپیوں اور مشاغل اور جھگڑوں سے زندگی کو پاک کرنا ' فاسقین اور فجاراور خدا سے غافل لوگوں سے تعلقات منقطع کرنا اور صالحین سے رابطہ قائم کرنا ' جاہلیت کے خادم اور حاکمیتِ رب العالمین کے مخالف اداروں سے تعلق توڑ لینا ' اپنے معاملات کو راستی ' عدل ' خدا ترسی ' بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا ' اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیام حکومت الٰہیہ کے نصب العین پر مرتکز کرنا اور ان تمام مصروفیتوں سے دستکش ہوجانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔ دستور میں قرار دیا گیا کہ جماعت میں کسی شخص کے مرتبہ و مقام کا تعین انہی تدریجی تغیرات کے ناقص اور کامل ہونے پر کیا جائے گا۔

جماعت میں شامل ہونے والوں کی درجہ بندی

نظام جماعت بالکل سیدھا سادہ تھا۔ اس میں شامل ہونے والوں کو جماعت اور اس کے

مقصد و نصب العین کے ساتھ تعلق اور وابستگی کی بنیاد پر تین طبقات میں تقسیم کیا گیا تھا۔

☆ صفِ اوّل کے وہ لوگ تھے جو نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں، اپنے آپ کو کلیتہً جماعت کے حوالے کر دیں، جنھیں جماعت جب پکارے لبیک کہیں اور جو خدمت سونپے اسے انجام دیں اور جان، مال، اولاد، عزیز و اقارب، دوست غرض کسی چیز کو خدا و رسولؐ اور مقصدِ اسلامی سے زیادہ عزیز نہ رکھیں۔ دستور کی رو سے یہی لوگ جماعت کے اصل کارکن اور کارفرما عنصر تھے اور رہنمائی اور سربراہی انھی کے ہاتھ میں تھی۔ احکام شرعیہ کی پابندی اور اس معاملے میں کسی قسم کی ڈھیل روا نہ رکھنا ان پر لازم تھا، یہ بھی لازم تھا کہ وہ مسلمانوں کی زندگی کا عملی نمونہ پیش کریں۔ اور رخصتوں کا سہارا لینے کے بجائے عزیمت کی راہ اختیار کریں۔ غیر الٰہی عدالت میں یہ لوگ نہ مستغیث بن کر جاسکتے تھے نہ مدعی بن کر۔ مدعا علیہ یا مستغاث علیہ کی حیثیت سے عدالت میں جانے کی صرف اسی صورت میں اجازت دی گئی تھی کہ یا تو کسی غیر معمولی نقصان کا خطرہ ہو یا گواہ کی حیثیت سے انھیں طلب کیا جائے۔

☆ صف دوم میں وہ لوگ شامل تھے جو اپنے آپ کو نہ تو جماعت کے لئے کلیتہً وقف کر سکتے ہوں نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا پورا بار اٹھانے کی ہمت و طاقت رکھتے ہوں، مگر اپنے وقت، اپنے مال اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا ایک حصہ راہ خدا میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ دینی فرائض اور احکامات الٰہی کی اطاعت کریں۔ حرام اور ناجائز وسائل کسب رزق اور مشاغل سے اجتناب کریں، جماعت اور اس کے نصب العین کے صدق دل سے وفادار رہیں، جماعت کی طرف سے جو خدمات سپرد کی جائیں انھیں راضی خوشی انجام دیں۔ دستور میں طے کیا گیا کہ اس صف کے لوگوں کو ذمہ داری کا کوئی منصب نہیں سونپا جائے گا۔ البتہ وہ جماعتی مشوروں میں شریک ہوسکیں گے۔

☆ صف سوم ان لوگوں کے لیے تھی جو کلمہ اسلام پر اصولی حیثیت سے ایمان لائیں اور شخصی زندگی کی حد تک احکام شرعی کی پابندی بھی قبول کریں مگر غیر الٰہی نظام سے وابستہ اپنے مفادات کا نقصان گوارا نہ کرسکیں۔ انھیں دوسری وفاداریوں پر خدا کی وفاداری کو مقدم رکھنا ہوگا، وہ غیر الٰہی نظام کو ترقی درجات کا وسیلہ نہ بنائیں گے اور نہ ان کے لئے کوشاں ہوں گے اور جماعت کو ہر جائز امکانی طریقے سے مدد دیں گے، یہ اصحاب جماعتی مشوروں میں اپنے اخلاص اور جماعت کو ان پر جس قدر اعتماد ہوگا اس کے مطابق شریک ہوسکیں گے۔ ۳۵

یہ تینوں درجہ بندیاں جماعت میں شامل کسی بھی شخص کے لیے جامد اور غیر متغیر نہ تھیں

بلکہ شخصی حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تبدیلی رونما ہو سکتی تھی۔ صفِ سوم کا آدمی جماعت کے نصب العین کی راہ میں پیش قدمی کرتا ہوا صفِ اوّل میں پہنچ سکتا تھا اور صفِ اوّل کا شخص عقیدہ و عمل کے مطلوبہ معیار سے گر جانے کی بنا پر صفِ سوم میں بھیجا جا سکتا تھا۔ دستور میں غیر الٰہی نظام کے ساتھ ان تینوں طبقات کے مطلوبہ رویے بھی متعین کر دیے گئے تھے۔ ان رویوں کے منافی طرزِ عمل کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والے شخص کو جماعت کے لیے قابلِ قبول یا لائق استرداد بنا سکتا تھا۔

شعبۂ خواتین کا قیام

دستور کی رُو سے جماعت کا ایک خواتین ونگ بھی تھا۔ ان پر دستور کی وہ تمام اعتقادی و نظریاتی اور نظمِ جماعت سے متعلق دفعات لاگو تھیں جن کا اطلاق مردوں پر ہوتا تھا البتہ مردوں سے الگ تخلیقی صلاحیتوں اور اسلامی معاشرے میں مخصوص حیثیت کی بنا پر ان کے لیے ان کا فطری دائرہ عمل متعین کیا گیا۔ ان کا کام اپنے گھر' اپنے خاندان' اپنے شوہروں اور بھائیوں اور اپنے حلقۂ تعارف میں دوسری عورتوں کے اندر دعوت و تبلیغ اور تجدیدِ ایمان اور اصلاحِ سیرت و کردار کرنا اور اپنے بچوں کے اندر نورِ ایمان اور اخلاقِ اسلامی پیدا کرنا تھا اور اگر ان کے شوہر' بیٹے اور بھائی جماعتِ اسلامی میں داخل ہوں تو صبر و عزیمت کے ساتھ ان کی رفاقت اور ہمت افزائی کرنا اور نصب العین کی راہ میں آنے والی مصیبتوں اور مشکلات میں صبر و ثبات کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹانا تھا۔

دستورِ جماعت میں ایک اہم دفعہ کا اضافہ

دستور کے ابتدائی مسودہ میں امیر کے انتخاب کے بارے میں کوئی دفعہ نہیں رکھی گئی تھی۳۶۔

غالباً سید مودودیؒ نے جماعتی تنظیم اور تحریکِ اسلامی کے اس ابتدائی مرحلے میں ازخود کوئی مستقل دفعہ دستور میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کام کو جماعتی تنظیم وجود میں آنے کے بعد ارکان جماعت پر چھوڑ دیا کہ وہ اس سلسلے میں اجتماعی طور پر خود فیصلہ کریں چنانچہ ۳ شعبان کو کئی گھنٹوں کی طویل بحث و تمحیص اور غور و خوض کے بعد دستور میں دفعہ دہم شامل کی گئی ۔ اس دفعہ میں کہا گیا تھا کہ جماعتِ اسلامی کا ایک امیر ہو گا جو معروف اصطلاح میں امیر المومنین نہیں بلکہ محض جماعت کا رہنما ہو گا۔ اس کی اطاعت فی المعروف جماعت کے تمام افراد کریں گے۔ اس کے انتخاب میں تقویٰ' علم دین میں بصیرت' اصابتِ رائے اور عزم و حزم کو

ملحوظ رکھا جائے گا' جماعت کی دعوت اپنے امیر کی شخصیت اور اس کی امارت کی طرف نہیں اپنے عقیدے اور نصب العین کی طرف ہوگی۔ امیر کی خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے یہ توقع کی جائے گی کہ وہ اپنے سے زیادہ اہل آدمی کے آجانے پر خود اس کے لیے جگہ خالی کر دے گا۔ ایسی صورت میں جبکہ جماعت اپنے نصب العین کے مفاد کے لیے ضرورت محسوس کرے' وہ امیر کو معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

جماعت کا لائحہ عمل

جماعت کے لیے دستور میں ابتدائی طور پر لائحہ عمل بھی وضع کر دیا گیا تھا جس کی رو سے اس میں شامل ہونے والے لوگ ایک طرف اپنے نفس اور زندگی کا تزکیہ کریں اور دوسری طرف جماعت سے باہر کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم' غیراللہ کا انکار کرنے اور حاکمیتِ رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں اور جب تک کوئی قوت ان کے مقصد کی راہ میں حائل نہ ہو اس سے وہ بھی چھیڑ چھاڑ نہ کریں اور اگر کوئی قوت حائل ہو تو خواہ وہ کوئی بھی قوت ہو اس کے علی الرغم اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتے رہیں اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں' ان کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔

دستور کی خصوصیات

☆ بلاشبہ یہ ایک نظریاتی انقلابی دستور تھا۔ جماعت اسلامی جو نصب العین اپنے سامنے رکھتی تھی اور مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں فکرو عمل کی جو تبدیلی لانا چاہتی تھی یہ دستور اس کے لیے ایک انقلابی راہ عمل متعین کرتا تھا۔ دوسری جماعتیں لوگوں کو اپنے اندر شامل کر کے انھیں آزاد چھوڑ دیتی تھیں کہ وہ انفرادی طور پر جو چاہیں طرز فکر و عمل اختیار کریں۔ انہیں ان کے فکر و نظر اور زندگی کے معمولات سے کوئی غرض نہ ہوتی تھی۔ اس طرح ان کے اندر بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے فکرو عمل میں متضاد اور رنگ برنگ کی سیرت و کردار کے حامل لوگ جمع ہوجاتے جو جہاں ایک طرف مسلمانوں کے اندر مزید اخلاقی زوال کا باعث ہوتے وہاں دوسری طرف ان کی صفوں میں فکری و عملی افتراق و انتشار کا سبب بنتے۔ یہ دستور نہ صرف نظام جماعت میں شامل ہونے والوں کو کڑے ڈسپلن میں کستا تھا اور کسی قسم کی ڈھیل برداشت نہ کرتا تھا بلکہ جماعت کے مقصد اور نصب العین کے مطابق ان کی فکرو نظر کو مطلوبہ مخصوص سانچے میں ڈھالتا اور کردار و عمل کی تربیت کے خطوط بھی متعین کرتا تھا۔ ان کے قول و عمل میں تضاد کو ختم کرنے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر زور دیتا' اسلام کی سربلندی اور

اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنے کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے لازمی قرار دیتا تھا کہ وہ پہلے خود اسلام پر عمل پیرا ہوں اور احکام الٰہی کو اپنی ذات پر نافذ کریں اور اس کے بعد معاشرے کو اس نظام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے آگے بڑھیں۔ اللہ کا نظام نظم و ضبط کا طلب گار ہے اور یہ نظم و ضبط جماعتی طور پر اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ انسان خود اپنی زندگی کو اس کا خوگر نہ بنائے۔

☆ اس دستور کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ سیاسی و دینی جماعتوں نے اپنے کارکنوں کی زندگی کو پبلک اور پرائیوٹ کی جس ثنویت میں تقسیم کر رکھا تھا' یہ دستور اس کی نفی کرتا تھا۔ یہ نظام جماعت میں شامل افراد کو خواہ وہ کارکن ہوں یا امیرِ جماعت' کسی امتیاز کے بغیر ہر ایک کی زندگی کو ایک اکائی قرار دیتا تھا جس میں دین و دنیا اور پبلک اور پرائیویٹ زندگی کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ ایسا نہ تھا کہ وہ پبلک میں آکر تو ایمان و اسلام اور اسلامی اخلاق و کردار اور حکومت الٰہیہ کی باتیں کریں اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اس طرف بلائیں' لیکن نجی محفلوں میں پہنچیں تو یہ چولا اتار دیں اور کارِ دیگر میں مصروف ہوجائیں۔ اس دستور نے نظمِ جماعت میں شریک ہونے والوں کے لیے لازمی قرار دیا تھا کہ خلوت ہو یا جلوت' پبلک اسٹیج ہو یا نجی مجلسیں ہر جگہ اسلامی احکام و تعلیمات کا عملی نمونہ بن کر رہیں۔

☆ اس دستور کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ جس غیرالٰہی نظام کو مٹانے کا اس نے اعلان کیا تھا اس کے ساتھ اس نے کسی قسم کے تعاون کو حرام قرار دے دیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ یہ ملک کے باہر سے آئی ہوئی قوم کا مسلط کردہ نظام تھا بلکہ اس لیے کہ یہ ایک مسلمان کے عقیدے اور اس عقیدے کے دیے ہوئے زندگی کے نصب العین کے منافی نظام تھا۔ اب تک مسلم وغیر مسلم جو جماعتیں ملک کے اندر کام کر رہی تھیں ان کا یہ حال تھا کہ نظریاتی طور پر تو برطانوی حکومت کے چنگل سے آزادی حاصل کرنا یا اس کو مٹانا ان کا نصب العین تھا لیکن عملاً وہ زندگی کے میدان میں --- قانون ساز اسمبلیوں میں' انتظامی اداروں میں' عدالتوں میں، تعلیمی اداروں میں' معاشرتی و تمدنی اور ثقافتی و اقتصادی شعبوں میں ---- اس کے ساتھ تعاون کر رہی تھیں' جماعتِ اسلامی پہلی جماعت تھی اور اس کا دستور برصغیر میں کسی جماعت کا پہلا دستور تھا جس نے حاکمیتِ غیراللہ کو اپنے عقیدے کی بنا پر چیلنج کیا تو اس پر قائم تمام نظام ہائے حیات کے ساتھ کسی قسم کے تعاون' حتیٰ کہ اپنے حقوق کی طلب اور تحفظ کے لیے اس کی عدالتوں میں جانے تک کو حرام قرار دیدیا۔ غیرالٰہی نظام حکومت کی خدمت اور چاکری جدید تعلیم

یافتہ مسلمانوں کی زندگی کی معراج بن گئی تھی۔ جماعتِ اسلامی کے دستور نے اس حکومت کے بعض شعبوں کی ملازمت کو تو بالکل حرام قرار دے دیا جس کا قلادہ گردن میں ڈالے ہوئے کوئی شخص جماعت کا رکن نہیں بن سکتا تھا اور بعض شعبوں کی ملازمت کو مجبوراً برداشت کیا بھی تو عارضی طور پر اس طرح جیسے حالت اضطرار میں لحم خنزیر اور مردار۔

حواشی و تعلیقات

۲۳۔ روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول ۴، ۵

۲۴۔ ایضاً ص ۵، ۶

۲۵۔ ایضاً ص ۶

۲۶۔ روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول ص ۶، ۷

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول ص ۸، ۹

۲۹۔ روایت شیخ فقیر حسین (مرحوم) تذکرہ سید مودودیؒ ۲۵۹۔ دستور کے سلسلے میں سید صاحبؒ نے جو مضمون رقم فرمایا اس میں لکھا: جماعتی تشکیل کا جو ابتدائی خاکہ محرم کے پرچہ میں شائع کیا گیا اس پر غور کیا گیا اور باہمی مشورہ سے بالاتفاق ایک دستورِ جماعت مرتب ہوا۔

۳۰۔ روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول ص ۹، نیز خطوطِ مودودی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص ۴۰

۳۱۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہ مسودہ سید مودودیؒ کی نظر سے گزر چکا ہے، انھوں نے کمیٹی کے قیام کے ذکر کو جوں کا توں رہنے دیا۔

۳۱۔ الف۔ چوہدری غلام محمد مرحوم کی یہ روایت درست ہے۔ یہ کمیٹی گیارہ بارہ افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں میں بھی شریک ہوا۔ اس کا کافی طویل اجلاس مولانا کے ڈرائنگ روم کے بالمقابل کمرے میں ہوا۔ طفیل محمد

۳۲۔ روداد جماعتِ اسلامی حصہ اول ص ۹

۳۳۔ ترجمان القرآن جلد ۲۰ عدد ۳ مئی ۱۹۴۱ء ص ۴

۳۴۔ ایضاً ص ۳۔ ترجمان القرآن کا یہ شمارہ اگرچہ مئی کا شمارہ تھا، لیکن شائع ستمبر ۱۹۴۱ء میں یعنی جماعت اسلامی بننے کے بعد ہوا۔ ان دنوں ترجمان القرآن کاغذ وغیرہ کی مشکلات کے باعث بالعموم کئی کئی ماہ تاخیر سے شائع ہوتا تھا اور بسااوقات دو دو تین تین ماہ کی مشترکہ اشاعت ہوا کرتی تھی۔

باقی صفحہ ۴۸ پر

خصوصی تجزیہ

نفاذِ شریعت ایکٹ پر اعتراضات کا
---- ایک علمی محاکمہ ----

قسط (۲)

پروفیسر خورشید احمد

معترضین کے باقی نکات پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک اصولی نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات کی غلط فہمی غلط مبحث کا نتیجہ نہیں اور اخلاص پر مبنی ہے' اس کی وجہ غالباً مندرجہ ذیل وجوہ میں سے ایک یا دونوں ہو سکتی ہیں:

۱۔ قانون کے مغربی تصور اور اسلامی تصور میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ مغربی تصورِ قانون میں مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف ان انسانی روابط و سلوک کے قواعد و ضوابط سے ہے جو بالآخر عدالتوں کے ذریعہ نافذ ہو سکیں اور جن کی عدم پابندی جرم و سزا پر منتج ہوتی ہے۔ مشہور ماہرِ قانون پیٹن (paton) اپنی کتاب Text book of Jurisprudence میں قانون کی یہ تعریف کرتا ہے:

> "قانون وہ آئینی نظام ہے' جسے کوئی معاشرہ یا اجتماع اصطلاحاً" یا رسماً" اختیار کرے اور یہ اس مجموعۂ قوانین پر مشتمل ہوتا ہے جسے یہ اجتماع اپنے ہاں ایک خاص مشینری کے قیام کے ذریعہ بغرضِ حصولِ اطاعت نافذ کرنے کے لئے آمادہ ہو"۔ (صفحہ ۸۵)

یہی وجہ ہے کہ قانون اور ریاستی اعتبار سے قوت قاہرہ (Coercive power) لازم و ملزوم ہیں۔

اس کے برعکس اسلام کا تصورِ قانون زیادہ وسیع ہے' یہاں ہر قانون کے لئے عدالت کے ذریعہ نافذ ہونا ضروری نہیں ہے' گو اسلامی قانون کا ایک حصہ ایسا ہے جو ریاست کی قوتِ قاہرہ

کے ذریعہ نافذ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون عبادات ' معاملات' مناکحات ' سیاستِ مدن' جنگ و صلح سب پر حاوی ہے۔ شریعت کو بالاتر قانون ماننے کے معنی یہ ہیں کہ پوری شریعت بالاتر قانون ہوگی جس کا کچھ حصہ فرد خود اپنے اوپر نافذ کرے گا اور کچھ حصے حکومت کے اداروں کے ذریعہ نافذالعمل ہوں گے۔ اور اس طرح اخلاق اور قوتِ قاہرہ کے امتزاج سے فرد اور معاشرہ کی اصلاح کا کام انجام پاتا ہے۔

۲- دوسری وجہ کا تعلق قانون کی اس اینگلو سیکسن (Anglo - Saxon) روایت سے ہے جس سے ملک کا قانون دان طبقہ آشنا ہے اس روایت کے مطابق کم از کم نظری طور پر ' رائج "مجموعہ قوانین" سے ہٹ کر کسی بالاتر قانون کو ماننا' اور پھر اس بالاتر قانون کی روشنی میں خود "مجموعہ قوانین " پر نقد و احتساب کا کام انجام دینا' ایک غیر معروف سی شے ہے۔ پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون اعلیٰ ترین قانون سمجھا جاتا ہے' اور روایتی پوزیشن یہی ہے کہ پارلیمنٹ حاکم اعلیٰ ہے اور اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی!

اسلام تو ظاہر ہے کہ اس پوزیشن کو تسلیم نہیں کرتا ۔ اسلام کی نگاہ میں فرد اور ریاست دونوں ' اور اس طرح خود ریاست کے اداروں میں پارلیمنٹ ' انتظامیہ اور عدلیہ سب 'ایک بالا تر قانون کے تابع ہیں' اور وہ ہے قرآن و سنت۔ اصل حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے' اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نمائندہ اور رسول کی حیثیت سے شارع کا مقام رکھتا ہے۔ پارلیمنٹ کا کام شریعت کے مطابق قانون سازی کرنا ہے۔ اور جن معاملات میں کتاب و سنت خاموش ہوں ان کے بارے میں شریعت کے مقاصد کی روشنی میں نئی قانون سازی کرنا ہے۔

لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں عام طور پر ' ان سیکولر اور جمہوری ممالک میں بھی جو عوام کی حاکمیت اور پارلیمنٹ کی بالادستی کے اصول پر قائم ہیں ' جہاں نظام جمہوری ہے لیکن روایات پر بھی قائم ہے' پارلیمنٹ یا مقننہ کی یہ حاکمیت مطلقہ تسلیم کی گئی ہے ؟ کیا کہیں بھی پارلیمنٹ کا حق قانون سازی لا محدود ہے؟ کیا اس پر عموماً پارلیمنٹ سے ماسوا اداروں کو نقد و احتساب اور رد و قبول کا حق نہیں دیا گیا ہے ؟ کیا خود پاکستان میں ایسا نہیں ؟ اور کیا ایسا ہونے سے جمہوریت ' رائے عامہ کی اور پارلیمنٹ کی بالادستی ختم ہو جاتی ہے؟

ان سوالات کے جائزہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجائیگی کہ قرآن و سنت کی بالادستی اور اس ضمن میں نقد و احتساب کے اختیارات عدالتوں کو تفویض کرنے کے نتیجے میں ما.لہ.ء ے کی

بالا دستی ختم ہو جانے کا ڈھنڈورہ کتنا بے بنیاد ہے۔

برطانیہ کی قانونی تاریخ کا بھی اگر جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ جدید سیکولر (لادینی) فکر کے غلبہ سے قبل وہاں بھی پارلیمنٹ کے منظور کردہ قانون کو حقوق عامہ اور عقل سلیم پر فوقیت نہیں دی جاتی تھی۔ لارڈ جسٹس کوک (Coke) نے ۱۶۱۰ء میں ڈاکٹر بونہام کے مشہور مقدمہ میں اپنے فیصلہ میں لکھا تھا کہ

"جب پارلیمنٹ کا منظور کردہ کوئی قانون عام حق (Common Right) یا عقل سلیم (Reason) کے خلاف ہوگا یا اس پر عمل نا ممکن ہوگا تو پھر معاملہ کا فیصلہ کامن لاء کی روشنی میں ہوگا اور ایسے وضعی قانون کو غیر مؤثر (Void) قرار دیا جائے گا"۔ (77 E.R. 647' 652 (1610))

جسٹس کوک کے جانشین لاڈر چیف جسٹس ہوبرٹ (Hobert) نے بھی اسی نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے۔

"پارلیمنٹ کا بنایا ہوا ایک وضعی قانون بھی' اگر وہ فطری انصاف (Natural Equity) کے خلاف ہے تو اسے غیر مؤثر قرار دیا جائے گا۔"

(Day vs Savadge, 80 , E.R. 235 ' 237' (1615)

اسی طرح چیف جسٹس ہولڈ (Hold) نے بھی اس موقف کی تائید کی۔ اس کے بعد وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جس میں دستور مملکت کو ایک تحریری دستاویز میں منضبط کیا جانے لگا۔ امریکہ میں تحریری دستور بننے کے بعد دستور کو بالاتر قانون تسلیم کیا گیا اور کانگریس قانون سازی میں اس کے تابع ہے۔ جسٹس مارش کا یہ فیصلہ آج تک امریکی قانونی روایت کی بنیاد ہے کہ

"دستور خود سب سے بڑا قانون ہے اور یہ ذمہ داری عدالتوں کی ہے نہ کہ مقننہ کی' کہ کونسا قانون دستور کی حدود سے تجاوز کر گیا ہے اور کس بناء پر وہ غیر مؤثر ہے"۔

(Marbury v.s. Madison)

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سو سال میں امریکہ کی عدالتِ عالیہ نے دو سو ستره قوانین کو خلاف دستور' بے ضابطہ اور غیر مؤثر قرار دیا ہے اور اس سے نہ مقننہ کی ناک کٹی ہے نہ اس کی بالادستی پر کوئی حرف آیا ہے اور نہ عدالت کی "آمریت" کا کوئی ہوا کھڑا ہوا ہے۔ بلکہ مقننہ کا قانون سازی کا حق اور عدلیہ کا قانون کو "بالاتر قانون" کی میزان پر پرکھنے کا اختیار ——— دونوں

جمہوری روایت کا حصہ تسلیم کئے جاتے ہیں ' ان جمہوری روایات کا جو حاکمیتِ الٰہی نہیں بلکہ حاکمیتِ جمہور پر قائم ہیں۔

دنیا کے دساتیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر ممالک میں بالا ترین پارلیمنٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دستور کے مطابق قانون سازی کا کام انجام دے۔ فرانس ' کینیڈا ' ڈنمارک ' فن لینڈ' ایران اور کیمرون میں تو ایسی دستوری کونسل کا وجود ہے جو پارلیمنٹ میں کسی بل کے پیش ہونے کے بعد' اور پارلیمنٹ میں اس کے منظور ہونے یا صدر کی توثیق سے پہلے ہی اس بل کے دستوری یا دستور سے متصادم ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ مگر دنیا کے بیشتر ممالک میں عدالتوں ہی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک بل کے منظور ہونے کے بعد بھی اس کا جائزہ لیں اور اگر اسے دستور سے متصادم پائیں تو کالعدم قرار دے دیں۔ ارجنٹائن میں یہ مقام عام عدالتوں کو دیا گیا ہے۔ آسٹریلیا ' ڈنمارک ' اسرائیل ' اردن ' ناروے' پاکستان ' ہندوستان اور امریکہ میں یہ اختیار عدالت عالیہ (High Court) کو حاصل ہے جس کے فیصلہ پر آخری فیصلہ سپریم کورٹ کرتی ہے۔ کچھ دوسرے ممالک میں قانون منظور ہوجانے کے بعد اعلیٰ عدالتوں میں صرف سپریم کورٹ ہی قوانین کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ یہ پوزیشن آسٹریا ' برازیل ' کیمرون' کوسٹاریکا ' آئرلینڈ ' جاپان ' ویت نام ' سینیگال میں پائی جاتی ہے۔ کچھ دوسرے ممالک میں ایک علیحدہ دستوری عدالت یا کونسل قائم کی گئی ہے جس کا کام صرف دستوری امور کا فیصلہ کرنا ہے۔ ایسی دستوری عدالتیں آسٹریا (Austria) جرمنی ' اٹلی ' مالٹا ' کوریا' اسپین ' سری لنکا اور یوگو سلاویہ میں قائم ہیں۔ ہندوستان میں تو سپریم کورٹ عام قوانین ہی نہیں 'دو تہائی اکثریت سے منظور شدہ دستوری ترمیم کو بھی غیر دستوری قرار دینے کی روایت قائم کر چکی ہے اور اس سے بھی پارلیمنٹ کی بالا دستی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کو عدالت کے احتساب کے لیے کھولنا جمہوری روایت کا حصہ ہے۔ اس سے نہ پارلیمنٹ کی حاکمیت پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ پارلیمنٹ پر عدلیہ کی بالا دستی قائم ہوتی ہے۔ ہمارے قانون ساز اداروں کے ان ارکان کو جو پارلیمنٹ کی بالا دستی کی دہائی دے کے شریعت کی بالا دستی کی مخالفت کرتے ہیں ' وہ خود بیشمار معاملات میں پارلیمنٹ کے قوانین کو مسترد کرنے کا حق عدالتوں کو تفویض کرتے ہیں۔ پھر صرف شریعت کے معاملہ میں ہی ایسی حساسیت یا نزاکت کا مظاہرہ کیوں؟ جدید سیاسی نظریہ تو مبنی ہی مقننہ ' انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان توازنِ اختیار

(Balance of power) پر ہے ۔ اس سے کسی ایک ادارہ پر دوسرے کے بالا دستی قائم نہیں ہوتی بلکہ ہر ایک دوسرے سے اس طرح مربوط اور متعلق ہوتا ہے کہ عوام کے حقوق محفوظ ہو سکیں اور ریاست کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔

پارلیمنٹ کے جن ارکان یا دوسرے مبصرین نے شریعت کے بالاتر قانون تسلیم کیے جانے سے پارلیمنٹ کی حاکمیت پر حرف آنے کی دہائی دے کر جس "نازک مزاجی" کا مظاہرہ کیا ہے وہ ناقابل فہم ہے۔ شریعت کی بالادستی پر 'جس کے اقرار ہی سے ہم مسلمان بنتے ہیں' تو وہ اتنے برا فروختہ ہیں ' لیکن اس امر پر ان کی پیشانی پر شکن بھی نہیں پڑتی کہ بہت سے معاملات میں پارلیمنٹ کے ہاتھ اور پاؤں آج بھی بندھے ہوئے ہیں ۔ اور اس دستور کے تحت بندھے ہوئے ہیں جسے ۱۹۷۳ء کا "اصل دستور" کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر قانون سازی کے لئے دو فہرستیں دستور میں دی گئی ہیں ' اور ان سے ہٹ کر پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں کے لیے قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں ' اسی طرح صوبوں کی حدود کے بارے میں پارلیمنٹ صرف اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی ۔ دفعہ ۲۲۷' احکامات اسلامی کے بارے میں پارلیمنٹ کے اختیارات کی تحدید کرتی ہے۔ دستور اور دستور کے شیڈولڈز کی بناء پر ۲۵ قوانین ایسے ہیں ' اور ان میں سے بیشتر قوانین وہ ہیں جو فوجی آمریت کے ادوار میں بنائے گئے تھے ' جن میں عام قانون سازی کے طریقے پر کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی ۔ ۱۹۷۳ء کے اس دستور میں جسے جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے منظور کرایا تھا ' وزیر اعظم کے ایک بار منتخب ہوجانے کے بعد اس کو عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعہ ہٹانے کے معروف طریقہ کو اس طرح جکڑ بندیوں کا شکار کرایا گیا تھا کہ عملاً پارلیمنٹ اور خود حکمران پارٹی کو وزیر اعظم کو ہٹانے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس پر خود بھٹو صاحب کے سابق وزیر قانون جناب محمود علی قصوری نے بڑے سخت الفاظ میں اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ دستور کی دفعہ ۸ بھی پارلیمنٹ کے حق قانون سازی پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے اور صحیح طور پر کرتی ہے۔ لیکن اتنے بہت سے "بالاتر قوانین" کی موجودگی میں پارلیمنٹ کی "حاکمیتِ اعلیٰ" متاثر نہیں ہوئی ' البتہ اللہ کی شریعت کو بالاتر قانون تسلیم کرنے سے اسکی ناک کٹ جاتی ہے؟

ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے!

تیسرے اور چوتھے اعتراض کے بارے میں مندرجہ بالا معروضات کافی ہیں۔ البتہ آخری اعتراض میں وزن ہے، مگر اس کا مناسب حل ممکن ہے اور ضرور کیا جانا چاہیے ۔ چونکہ ہمارا تعلیمی نظام، اور خصوصیت سے قانون کی تعلیم کا نظام ، ناقص ہے، اسی طرح عدلیہ کے لئے تقرری کا معیار (Criterion) بھی اسلامی اعتبار سے ناکافی ہے، اس لئے ان سب کی اصلاح کی ضرورت ہے تاکہ فی الحقیقت عدلیہ میں ہر سطح پر جدید قانون اور اسلامی فقہ اور اصول فقہ کا علم رکھنے والے افراد آسکیں ۔ اس کمی کا تقاضہ ہے کہ اسے جلد از جلد پورا کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ عدلیہ کے موجودہ افراد کے لئے خصوصی تربیتی پروگرام ، اعلیٰ جوڈیشل اکیڈیمی کے تحت فوری طور پر شروع کئے جائیں ، عدلیہ میں مختلف سطح پر دینی علم رکھنے والے علماء اور فقہاء کا تقرر بطور جج ، مفتی یا مشیر عدالت کیا جائے اور مستقبل کے لئے قانون کی تعلیم کے نظام کی اصلاح اور عدالت میں تقرری کے معیار کو وسیع کیا جائے تاکہ مستقبل کی عدلیہ جدید قانون اور اسلامی فقہ اور اصول فقہ دونوں پر مہارت رکھنے والوں پر مشتمل ہو سکے۔

البتہ اعتراض کا یہ پہلو قطعاً نا قابل قبول ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ چونکہ ایسے افراد نہیں ہیں اس لیے شریعت کے نفاذ کے عمل میں عدلیہ کو کوئی کردار نہیں دیا جاسکتا ۔ اگر یہ دلیل صحیح ہے تو پھر ہم بڑے ادب سے عرض کریں گے کہ جو حالت آج قانون ساز اداروں کے ارکان کے علوم دینی و دنیاوی پر مہارت کی ہے اس کی روشنی میں تو ان کو قانون سازی کے اختیارات دینا بھی محل نظر ہو جائے گا۔ مسئلہ کا حل اس کمی کو پورا کرنا ہے ، جو عدلیہ کے موجودہ نظام میں ہے ۔ اور اسی طرح خود مقننہ اور اس کے افراد کے معیار کو بلند کرنے کی بھی فکر ہونی چاہیے ۔ جیسا کہ دستور کی دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کا تقاضا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی غیر متعلق نہیں ہوگا کہ جب برطانوی دور میں شخصی قانون کو سامراجی قوتوں کے مسلط کردہ قانون کے دائرہ سے باہر رکھا گیا ، اور اسے مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے اپنے مذہبی قانون کے تابع کیا گیا، تب بھی اس خدشہ کا اظہار ہوا تھا کہ ایک مذہبی قانون کو نافذ کرنے کی ذمہ داری اس عدلیہ کو دی جارہی ہے جو اس قانون کی ماہر نہیں۔ بلکہ وہاں تو مسلم پرسنل لاء کا نفاذ غیر مسلم ججوں تک کے ہاتھوں میں تھا۔ لیکن چونکہ قانون کی مسلمہ کتابوں اور مآخذ کا بالعموم احترام کیا گیا اس لئے انگریز کے سو سالہ دور میں چند ہی واقعات ایسے ہوئے جب عدلیہ کا فیصلہ فقہ اور اصول فقہ کے خلاف تھا ، اور ان حالات میں مسلمان اہلِ علم اور وکلاء نے تنقید و احتساب کے ذریعہ صحیح اسلامی پوزیشن کو پامال ہونے سے

بچالیا۔

گزشتہ دس بارہ سال کا تجربہ بھی اس کا گواہ ہے کہ عدلیہ کے فیصلوں میں اب شریعت اور اس کے احکام و قوانین پر زیادہ کھل کر بحث ہو رہی ہے اور مسلمان فقہاء کی آراء سے استشہاد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایک مثبت عمل ہے اور اس کے اچھے نتائج نکلیں گے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہماری رائے میں کسی قانون کے شریعت کے خلاف ہونے کے بارے میں فیصلہ کا اختیار موجودہ حالات میں ' فیڈرل شریعت کورٹ یا عدالت عالیہ (ہائی کورٹ ' سپریم کورٹ) تک محدود کرنا قرینِ حکمت ہے۔ یہی مؤقف سینٹ میں پاس شدہ بل میں اختیار کیا گیا تھا اور ہم اسے موجودہ ایکٹ سے رونما ہونے والی پوزیشن کے مقابلہ میں واضح سمجھتے ہیں ۔ ہماری نگاہ میں اس مسئلہ پر حکومت اور پارلیمنٹ کو غور و فکر جاری رکھنا چاہیے۔ اور جتنا جلد ممکن ہو ترمیم کے ذریعہ اس پوزیشن کو واضح کردینا چاہیے ۔ البتہ جب چند سالوں کے تجربہ سے 'اور عدالتی نظام میں ہر سطح پر دین کا علم رکھنے والے لوگوں کے شامل ہوجانے سے ' صورت حال بہتر ہوجائے تو پھر دائرہ کو وسیع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ آخر بارہ تیرہ سو سال تک مسلمانوں کے نظامِ قضاء میں نچلی اور اعلیٰ دونوں سطح کے قاضی ہی ان امور پر فیصلہ کرتے رہے ہیں اور کبھی ذہنی خلفشار کی صورت پیدا نہیں ہوئی ۔ اگر کہیں فیصلہ میں خطا ہوئی ہے تو جلد ہی اسکی اصلاح بھی اسی نظام کے اندر ہوگئی ہے' اور یہی راستہ فکری اور عملی ترقی کا راستہ ہے۔

ضروری اطلاع

بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر نومبر ۹۱ء کا شمارہ بروقت شائع نہ ہو سکا' چنانچہ نومبر ۹۱ء اور دسمبر ۹۱ء کا مشترکہ شمارہ شائع کیا گیا' اس شمارے کی ضخامت بھی دوگنی تھی۔

مذکورہ اشاعت کو شمارہ نومبر' دسمبر ۹۱ جلد ۱۱۶ عدد ۳ '۴ تصور کیا جائے۔

منیجر
ماہنامہ' ترجمان القرآن لاہور

رسائل و مسائل

متعیّن منافع دینا سود ہے

سوال: میں نے اپنی ہمشیرہ سے کاروبار کے لیے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ لیا ہوا ہے اور ان سے یہ طے کیا ہوا ہے کہ میں آپ کو ہر مہینے آپ کے خرچہ کے لیے تھوڑی سے رقم دیتا رہوں گا۔ ہم سب نے اپنا کاروباری منافع اندازے سے بنایا ہوا ہے جس میں سے ہر مہینے ہم اپنی ہمشیرہ کو ۲۲۵۰ روپے دیتے ہیں' پوچھنا یہ ہے کہ آیا یہ طریقہ درست ہے۔ اس سے ہماری ہمشیرہ مطمئن ہے۔ مگر میرے ذہن میں یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس سے کسی طرح کوئی سود کی شق نہ نکلتی ہو۔

جواب: کاروبار میں کسی کی رقم پر متعیّن منافع دینا سود ہوتا ہے۔ آپ اپنی ہمشیرہ کو ماہوار ۲۲۵۰ روپے منافع دے رہے ہیں۔ اگر بہن کے لیے آپ کے نزدیک یہی منافع ہے اور آپ نے متناسب نفع نہیں رکھا جسکی بناء پر ۲۲۵۰ روپے ماہوار رقم میں کمی بیشی ممکن ہو تو سود شمار ہوگا۔ اس لیے کہ غیر سودی منافع کیلیے ایک تو یہ ضروری ہے کہ نفع و نقصان دونوں میں شراکت ہو اور دوسرا یہ ضروری ہے کہ متناسب منافع ہو یعنی کل منافع کا نصف نصف یا ۲/۳ آپ کا اور ۱/۳ بہن کا یا کوئی اور نسبت جو بھی آپ طے کر دیں اس کے حساب سے منافع کو تقسیم کیا جائے۔ ایسی صورت اختیار کی جائے تب ہی یہ معاملہ غیر سودی ہوگا ورنہ نہیں۔

نماز میں لفظ "اللہ" کو مرکزِ توجہ بنانا بے سند بات ہے

سوال: اسم "اللہ" جو کہ خدائے تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی کیا ہیں اور اسلامی

اور قرآنی اصطلاح میں اس کے معنی کیا ہیں؟ اسے مفصّل طور تحریر فرمائیں۔

دوسرے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ لفظ اللہ کا ہر وقت اور ہر حال میں زبان سے نہیں بلکہ دل سے ذکر کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے جہاں اور بہت سے فیوض و برکات حاصل ہوں گے وہاں یہ لفظ اللہ جو کہ پانچ حروف کا مجموعہ ہے' قرآن مجید میں بھی سینکڑوں مقام پر آیا ہے' اس کا ایکبار ذکر کرنے سے پچاس نیکیاں ذاکر کے نامہ اعمال میں درج ہو جاتی ہیں۔ آپ یہ فرمائیں کہ کیا واقعی زبان کی بجائے دل سے "اللہ" پڑھنے سے اتنی ہی نیکیاں مل سکتی ہیں یا مل جائیں گی۔

دوسرے وہ بزرگ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب تم نماز پڑھنی شروع کرو تو یہ تصوّر کرو کہ لفظ "اللہ" سنہری حروف میں تمہارے دل پر لکھا ہوا ہے' تم نماز کی ادائیگی کے دوران اپنی آنکھیں بند کر کے "اللہ" کے لفظ کی جانب متوجہ رہو اور زبان سے نماز کے مسنونہ الفاظ پڑھتے رہو اس طرح کرنے سے کیا شرعی طور پر نماز میں کوئی نقص تو واقع نہیں ہوتا؟

جواب: لفظ اللہ کا ذکر زبان اور دل سے موجب اجر و ثواب اور خیروبرکت ہے۔ آپ زبان سے پورے کلمہ لا الہ الا اللہ کا ذکر کریں کیونکہ اسے حدیث میں افضل الذکر کہا گیا ہے۔ "اللہ" "اللہ" کے ذکر کا بھی حدیث میں تذکرہ آیا ہے۔ مسلم شریف کی روایت ہے۔ کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک زمین میں اللہ اللہ کرنے والا ہو۔ اس میں ذکرِ لسانی اور ذکرِ قلبی دونوں شامل ہیں اور دونوں ذکر جمع ہوں تو یہ افضل صورت ہوتی ہے دوسرا درجہ ذکرِ قلبی کا ہے۔ اس حد تک تو یہ بات صحیح ہے کہ آپ اللہ کا ذکر دل میں کریں۔ لیکن یہ بات کہ نماز میں آپ تلاوت کرتے رہیں اور اذکار زبان سے پڑھتے رہیں اور تصور لفظ اللہ کا کریں! یہ مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی بے سند ہے کہ آپ یہ تصور کریں کہ لفظ اللہ آپ کے دل پر سنہری حروف میں لکھا ہوا ہے۔ یہ نہ ذکر ہے نہ احادیث میں وارد ہے۔ اصل ذکر تو یہ ہے کہ دل میں اللہ کی عظمت و جلال کو تازہ کریں اور اپنی کوتاہیوں کو یاد کر کے شرمندگی کا احساس بیدار کریں۔ اور ایسا ذکر کریں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت پر آپ کو آمادہ کر دے' فرمانبرداری آسان اور نا فرمانی مشکل ہو جائے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ تین چیزیں جس میں پائی جائیں وہ ایمانی لذت کو پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اسکا رسولؐ اسے اللہ اور رسولؐ کے ماسوا دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو۔ دوسری چیز یہ کہ کسی سے محبت نہ ہو مگر اللہ سے۔ تیسری چیز یہ کہ کفر کی طرف لوٹنا ایسا ہو جیسے آگ میں پھینک دیا جانا۔ (حدیث بخاری و مسلم) پس اگر ذکر کے نتیجہ میں یہ صفات پیدا ہوں تو وہ ذکر' ذکر شمار ہوگا ورنہ نہیں۔ اسی کو ذکرِ قلبی کہا جاتا ہے۔

اور اس کے ایک حرف پر دس نیکیاں مل سکتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لفظ اللہ پر پچاس نیکیاں کم سے کم درجہ ہے جس کا امیدوار ہونا چاہیے۔ نیز تحقیقی بات یہی ہے کہ لفظ اللہ ذات باری تعالیٰ کا اسم ذاتی ہے۔ اس لیے اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی بھی یہی ہیں۔ لغوی اور اصطلاحی معنی کی بحث اس وقت ہوتی ہے جب یہ عَلَمِ ذات نہ ہو بلکہ اسمِ مشتق ہو۔

قسطوں پر اشیاء کی فروخت سودی معاملہ نہیں ہے

سوال: کوئی چیز قسطوں پر لیں تو وہ سود میں آتی ہے یا جائز ہے۔ مثلاً ایک موٹر سائیکل ہے' اس کی قیمت بازار میں ۳۰ ہزار ہے اور قسطوں پر تقریباً ڈھائی یا تین سال میں اس کی قیمت ۳۵ ہزار ادا کرنا پڑتی ہے۔ کیا وہ سود میں آتی ہے؟

جواب: نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کے ساتھ چیز فروخت کرنا اور خریدنا جائز ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ نقد فروخت کرنے کی صورت میں خریداروں کو مختلف قیمتوں پر دکاندار چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ کسی سے کم قیمت لیتے ہیں اور کسی سے زیادہ' لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ "ادھار" یا قسطوں کی صورت میں رقم بروقت ادا نہ کر سکنے کی صورت میں قیمت میں فرق نہ کیا جائے اور اتنی رقم وصول کی جائے جتنی طے کی گئی ہے۔ خریدار رقم ادا کر سکتا ہو تو اسے بروقت ادا کرنا چاہیے' نہ ادا کر سکتا ہو تو مالک کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ مزید مہلت دے دے۔ قرآن پاک میں ہے "پس مہلت دے دو آسانی تک" واللہ اعلم۔

روپے کی قیمت میں کمی کی صورت میں ادائیگیِ قرض

سوال: ایک شخص دکاندار کو کپاس لا کر فروخت کرتا رہا۔ نرخ مقرر کر کے حساب کیا گیا۔ شخص مذکور ساتھ ساتھ رقم لیتا رہا۔ جو کہ کئی ہزار تھی۔ کل قیمت میں سے دو ہزار روپیہ دکاندار کے ذمہ باقی بچ گیا تھا' جو دکاندار مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ادا نہ کر سکا۔ چالیس سال گزر جانے کے بعد دکاندار کی مالی حالت کچھ ٹھیک ہوئی' تو دکاندار نے شخصِ مذکور سے کہا۔ کہ اپنی بقایا رقم دو ہزار لے لو۔ شخصِ مذکور نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس وقت کپاس کا نرخ کم

تھا۔ اب بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ اس حساب سے رقم دو ۔ حالانکہ اس وقت نرخ طے کر کے حساب کر لیا گیا تھا۔ اور دو ہزار روپیہ دکاندار کے ذمہ باقی بچ گیا تھا۔

اب ادائیگی کیسے کی جائے ؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: قرض حسنہ یا دَین کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اسکی مثل چیز ادا کی جائے۔ نوٹ کا مثل نوٹ ہے۔ اس لئے اگر ایک شخص کے ذمہ دو ہزار روپے تھے تو اسے دو ہزار ہی لینے ہوں گے۔ جیسے اگر ایک شخص نے ۱۰ تولے سونا لیا تھا تو وہ ۱۰ تولے سونا ہی واپس لے سکتا ہے۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ۱۰ تولے کی قیمت اس وقت تھوڑی تھی اور آج ۱۰ تولے سونے کی قیمت زیادہ ہے۔ اگر مقروض کہے کہ اب میں ۱۰ تولے نہیں دونگا بلکہ ایک تولہ دوں گا۔ کیونکہ میں نے ۱۰ تولہ لیا تھا جسکی قیمت آج دس گنا بڑھ گئی ہے اور آج کا ایک تولہ اس وقت کے دس تولے کے برابر ہے تو اسکا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح قیمت کی کمی کی صورت میں بھی قرض خواہ کمی کے ازالہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ مزید وضاحت کیلئے گندم کی مثال دی جاسکتی ہے۔ آج گندم مہنگی ہے اور جس قدر روپیہ یا سونا چاندی سے آج آپ سو من گندم حاصل کرسکتے ہیں آج سے تیس سال قبل اس قدر روپیہ یا سونا چاندی سے ایک ہزار من گندم لے سکتے تھے لہٰذا اگر کسی نے آج سے تیس سال قبل ۱۰۰ من گندم قرض دی تھی تو وہ آج ایک ہزار من گندم کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اسی طرح آج سے بیس سال قبل ۱۰۰ روپے قرض دینے والا ایک ہزار روپے کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا بلکہ اسے صرف ۱۰۰ روپے کے مطالبہ کا حق ہے۔

بقیہ : حواشی و تعلیقات

۳۵۔ جماعت کی اصطلاح میں ان طبقات سے تعلق رکھنے والے اصحاب بالترتیب ارکان ، متفقین اور ہمدرد کہلاتے تھے۔

۳۶۔ قلمی مسودہ تاریخ جماعتِ اسلامی از سید نقی علی

مطبوعات

اسلام اور جدید ریاستی نظام: از جناب ڈاکٹر محمد سرور گورنمنٹ کالج لاہور۔ ناشر مکتبہ تعمیرِ انسانیت لاہور۔ ۳۱۸ صفحات۔ مجلد مع رنگین گردپوش۔ قیمت ۹۰ روپے۔

یہ دور جب سے اسلامی تحریکات ابھری ہیں، اسلامی نظام کے مباحث کا دور ہے۔ بہت نظریے سامنے آئے، کتابیں لکھی جارہی ہیں، اور اب نیو ورلڈ آرڈر کی سیلابی لہر کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ اہمیت اور بھی بڑھ جائیگی۔ انقلابِ ایران نے امکانات زیادہ روشن کردیے ہیں۔

ڈاکٹر محمد سرور ایک فاضل دانش ور ہیں۔ انہوں نے اسلامی نظامِ ریاست کے لیے ایک خاکہ تجویز کیا ہے، دوسری طرف احیائے اسلام کے بارے میں پاکستان اور ایران کے حالات پر تقابلی نظر ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دورِ حاضر میں پاکستان واحد ملک ہے جس کا قیام ہی اسلامی نظام کے نصب العین کے لیے ہوا، مگر مختلف مزاحمتوں نے اس کا مقصد پورا نہ ہونے دیا۔ دوسری طرف وہ ایران پر نگاہ ڈالتے ہیں جہاں عملاً انقلاب واقع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر محمد سرور صاحب نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر بتایا ہے کہ ایرانی انقلاب کی رو ۱۸۸۲ء کے تمباکو انقلاب کی شکل میں اٹھ کر، "جنگل انقلاب" کا دور گزارتی ہوئی نہایت جابر بادشاہتی اور جاگیرداری نظام اور کمیونسٹ تحریک کے دوپاٹوں کے درمیان عرصہ دراز تک پستی رہی، تا آنکہ امام خمینی کی قیادت میں انقلاب رونما ہوا جس کے لیے علمائے ایران نے بہت قربانیاں دی تھیں۔ لیکن صرف ایک جز کہ نظریہ امامت، تصورِ مجتہد، اور نیا اجتہادی نظریہ "ولایتِ فقیہ" پوری شیعہ قوم کو پیری مریدی کی شکل میں ایک مرکز پر مستقلاً متحد رکھنے کا موجب بنا ——— اس نے سالہا سال کی سعی مسلسل کو نتیجہ کامیابی تک پہنچایا۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے ایرانی انقلاب کے اثرات اور نظام نو کے جملہ پہلوؤں کو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے۔

دوسری طرف ان کی نظر دورِ حاضر کی سیاسی ہیئتوں کے مقابلے میں اسلامی نظامِ ریاست کی

برکات کو واضح کرنے کی جانب ہے ۔ اس سلسلے میں دستور' حاکمیت ' خلافت ' قانون سازی ' بنیادی حقوق پر بصیرت افروز نکات سامنے لائے گئے ہیں۔ ان بحثوں میں جزوی اختلافات کے پہلو نکلتے ہیں 'مگر ان پر بحث کرنے کی اجازت یہ اوراق نہیں دیتے۔

مجموعی طور پر اسلامی سیاست و ریاست کے مطالعہ کنندگان ' خصوصا طلبہ کے لئے یہ کتاب خاصی مفید ہے۔ مجھے بس ایک بات قابلِ توجہ معلوم ہوتی ہے جسے اسلامی نظریہ اجتماعیت و ریاست پر لکھنے اور سوچنے والے پوری طرح زیر غور نہیں لاتے ۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ دستوری یا عملی انتظام کیا ہے جو اسلامی ریاست کے امیر (اور اسکے گروہ) کو آمریت کی راہ اختیار کرنے اور فسطائیت پسند بننے سے روک سکے۔ مزید یہ کہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جو نظام جماعت اٹھے' اسے کن طریقوں سے اسکے طے شدہ اصولوں اور عملی روایتوں سے انحراف کرنے سے بچایا جاسکتا ہے جبکہ کارفرما قوتیں نیک نیتی سے اسے کسی اور رخ پر دھکیل کر لے جانا چاہتی ہوں۔ خلافت کے دور اواخر سے لے کر بعد کی کشاکشِ دین و اقتدار کی تاریخ پر آپ نظر ڈالیں تو یہ سوال بہت اہم محسوس ہوگا۔ آخر لوگ قربانیاں دے کر ایک ڈھانچہ اگر کھڑا کریں اور بعد میں کوئی اس کا حلیہ بگاڑ دے تو یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے۔ اور ایسی ٹریجڈیاں ہماری تاریخ میں بہت ملیں گی۔

مسائل و افکار: از جناب خرم جاہ مراد سابق صدر اسلامک فاؤنڈیشن (یو کے)۔ مرتبہ سلیم منصور خالد بہ تعاون مسلم سجاد ۔ ناشر البدر پبلی کیشنز ' ۱۲۔ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ سفید کاغذ پر کمپیوٹر طباعت ' رنگین دبیز سرورق ' صفحات ۲۲۸ ' قیمت ۴۸ روپے۔

اس کتاب میں تحریک اسلامی کے ایک معروف دانشور کے انٹرویوز جمع کئے گئے ہیں جن کا دور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۸۸ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح اسلامی جمعیت طلبہ (جس کے خرم صاحب ۱۹۵۱ء میں ناظم اعلیٰ بھی رہے ہیں)اور جماعت اسلامی کے متعلق ۳۹ سالہ احوال و مسائل کے متعلق سوالوں کے جواب سامنے آجاتے ہیں جن کی روشنی میں رفتارِ کار اور تغیرِ احوال کو سمجھا جاسکتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ تحریریں مساعیٔ اقامتِ دین کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی آتی ہیں کہ آدمی الجھتا ہے۔ ان سب پر گفتگو تو ممکن نہیں ' دو ایک امور بطور نمونہ عرض ہیں۔ بہت جگہ کسی معترضانہ سوال کے جواب میں خرم صاحب کے جواب کے

اجزا یہ ہوتے ہیں ۔ (۱) ہاں یہ بات ایک حد تک درست ہے۔ (۲) مگر ایسا کہاں نہیں ہوتا اور کون بچ سکتا ہے۔ (۳) تاہم کوشش کرنی چاہیے کہ یہ حالات بہتر ہوجائیں۔ "ہاں" "مگر" "تاہم" کی شکل میں ایک گونہ تضاد بیانی کی یہ مثلث بار بار سامنے آنے کی وجہ سے پریشان کرتی ہے۔ ایک تحریکِ تغیرو انقلاب کے کسی داعی یا نقیب کے لئے ایسا کمزور لہجہ موزوں نہیں لگتا۔

دوسری چیز جس نے مجھے حیران کیا' یہ ہے کہ کتاب کی مجموعی حیثیت میں اسکے تعارفی یا تقریبی صفحوں میں نہایت اُمل اور بے جوڑ طور پر ثبات و تغیر کے مسئلے پر چند سطور شامل کی گئی ہیں اور ان کے لئے زبان بھی ایسی استعمال کی گئی ہے جس سے ردِّ عمل کیفیت نمایاں ہے۔ یہ بحث ایک جامع مضمون چاہتی ہے کہ منکرینِ حدیث ' مغرب زدگان' اسلام گریز اکابر و خواتین وغیرہ بھی زمانے کے ساتھ تغیرِدین کی آواز اٹھاتے ہیں "آخر ان میں اور ہم میں کیا فرق ہے۔ نیز کتاب و سنت' اجماع صحابہ ' مسلک اسلاف ' جماعت کے دستور ' اس کے اعلان کردہ غیر متبدل اصولوں ' اسکی راسخ شدہ روایتوں (یہ دائرہ معروف) اور نظائر و شعائر نیز جماعت و تحریک کے معروفِ عام تشخص و معلومِ عام مزاج کے خلاف کن حالات میں کس حد تک اور کس احتیاط سے تبدیلیاں کرنی چاہئیں ۔ اس پہلو سے اگر کسی گروہ کی پالیسی بہت زیادہ سیال ہوجائے تو اس کا وقار نہیں رہتا۔ اتنے اہم اور نازک موضوع کے متعلق دو فقرے کسی مختلف مبحث میں پیوند کر دینا مفید نہیں ہوسکتا۔

یہ باتیں نہایت خلوص سے کہی گئی ہیں اور یہ ثبوت ہیں اس کا کہ کتاب کو میں نے پڑھا ہے۔ (بہت سے نوٹس چھوڑ دیے ہیں) مگر ان کا منشا ہرگز یہ نہیں کہ اتنی اچھی کتاب کی قدر و قیمت میں کچھ بھی کمی کی جائے۔ بلکہ میں دعوت اسلامی و تحریک حق کے لئے کام کرنے والوں کو متوجہ کروں گا کہ وہ اسے خصوصی اہمیت سے پڑھیں۔ فکری اور عملی دونوں میدانوں میں برادرم خرم جاہ مراد جیسی درخشاں شخصیتیں کہاں ملیں گی۔

پاکستان اکیسویں صدی کی جانب : از ڈاکٹر محمد فاروق خان' مردان ' باہتمام ادارۂ تکبیر کراچی ۔ کاغذ 'طباعت (کمپیوٹری) اور رنگین دبیز سرورق عمدہ۔ صفحات ۳۰۴ ۔ قیمت ۶۰ روپے۔

مجھے اس کتاب کو پڑھ کر مسرت ہوئی کہ ہمارے ہاں ایسے نوجوان ہیں جو پاکستان کی تعمیرو ترقی کے لئے اسکے مسائل پر غور کرتے ہیں ۔ خصوصا ڈاکٹر محمد فاروق خان جن کا اصل دائرہ کار

نفسیاتی معالجہ ہے' انہوں نے اس کتاب میں تقریباً ان تمام مسائل کو اپنے مطالعہ و شعور کی قوت سے پیش کردیا ہے جو پاکستان کو ایک فلاحی مملکت کے درجے تک پہنچنے کے لئے اپنا حل چاہتے ہیں۔

جذبات اچھے ہیں ' ان کا نقطۂ نظر خاصا محققانہ ہے' مگر اختلاف کے بعض اہم مقامات بھی سامنے آتے ہیں۔ مغربی ترقی کے دونوں پہلوؤں کا بہت اچھا نقشہ بیان کیا گیا ہے۔

ملک میں سرمایہ دارانہ ارتکاز' در آمدات و بر آمدات ' صنعتی صورت حال ' ٹیکسیشن سسٹم ' غیر ملکی قرضہ ' رشوت اور سفارش ' سیاسی نظام ' زرعی نظام ' نظام صحت ' نظام تعلیم ' قوم اور قومیتیں اور صوبائی خودمختاری 'عدالتی نظام 'بیوروکریسی ' خارجہ پالیسی کے جو حالات پائے جاتے ہیں اس کا جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان احوال و واردات کی تشکیلِ نو کے لئے ڈاکٹر صاحب نے تجاویز بھی دی ہیں۔

ان کی تجاویز میں بہت سے مثبت امور اچھے بھی ہیں ' نئے خیالات بھی ہیں ' مگر بعض معاملات میں انہوں نے اسلامی اصول و مقاصد کو درست طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ ایسے امور پیش کیے ہیں جن پر انہیں ازسرِ نو غور و تحقیق کرنی چاہیے۔

اس کتاب کا ایک باب اسلامائزیشن کا طریقِ کار ہے۔ اس موضوع پر اوروں نے بھی مختلف طریقے لکھے ہیں ' ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ اربابِ نظر محکم اسلامی نظریات کی بنیادوں پر اس باب کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

کتاب بہ ہرحال خیال انگیز اور پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانے کے لئے سوچنے پر اکساتی ہے۔

———— ○ ————

ہفت روزہ آئین کے ۶ خاص نمبر، مدیر: جناب مظفر بیگ (و دیگر مشیران و معاونین)۔ دفتر اشاعت: نسیم مارکیٹ '۲۱ ریلوے روڈ (نزد میو ہسپتال) لاہور ۵۴۰۰۰۔

ماہنامہ آئین بڑے بڑے سائز کے ۶ ضخیم نمبر (بعد میں فیصلہ ہوا کہ آٹھ)جن میں سے ہرماہ ایک نکلتا ہے' ان کا موضوع "جماعت اسلامی کے ۵۰ سال" ہے ۔مظفر بیگ اور ان کے ہم قدموں اور ہم قلموں نے بڑی محنت سے ہر خاص شمارے میں جماعتِ اسلامی کے دورِ رفتہ کے ماہ و سال کو تازہ کر دیا ہے۔ تمام واقعات قاری کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں 'کاروانِ تحریک کی حرکت ' رفتار اور اسکے راستے کے خم و پیچ اور نشیب و فراز ایک فلم کی طرح سے نظر کے

سامنے سے گزرتے ہیں۔ ہر دور کے متعلق اہم تقریریں ' تحریریں 'بیانات اور دوسرا تاریخی مواد سامنے آجاتا ہے۔ یہ خاص نمبر ایک ایسی دوربینی نگاہِ بازگشت ہیں کہ بے شمار بھولی بسری حقیقتیں اور شخصیتیں اور معرکے ذہن میں تازہ ہوجاتے ہیں۔ اس طرح کی تاریخی اور دستاویزاتی کاوش ہمارے ماضی و حال کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرسکتی ہیں ' ورنہ ان کا تعلق آپس میں ٹوٹ جائے جب حال کا تعلق ماضی سے ٹوٹتا ہے تو پھر مستقبل بھی حال سے دور بھاگ جاتا ہے ' حتیٰ کہ ان میں یگانگت نہیں رہتی ۔ تمام دائروں اور تمام شعبوں کے حالات اور بین الاقوامی دعوت کی مساعی کا تذکرہ بھی شامل ہے ۔

آٹھ میں سے چار نمبر چھپ چکے ہیں ۔ جنوری 'فروری ' مارچ ' اپریل کے چار نمبر اور باقی ہیں ۔ کم ضخامت والے نمبروں کی قیمت ۱۵ روپے ہے' زیادہ ضخامت ہو تو ۳۰ روپے ۔ اس قیمتی خزانے میں ایک لائبریری سمودی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے مستقل قارئین اور ایجنٹ صاحبان کوشش کرکے دوسروں تک پھیلائیں ۔

قرآن کا عائلی قانون: از جناب ڈاکٹر حافظ احسان الحق صاحب (جامعہ کراچی) ناشر : ادارہ معارف اسلامی ڈی ۳۵ ' بلاک نمبر ۵ ' فیڈرل بی ایریا' کراچی ۷۵۹۵۰ ۔ کاغذ سفید' صفحات ۹۹' سرورق دیدہ زیب رنگین ' قیمت ۳۰ روپے۔

حافظ احسان الحق صاحب نے طلبائے قانون اور عام مطالعہ کنندگان کے لئے "قرآن کا عائلی قانون" کے نام سے بہت اچھی کتاب پیش کردی ہے۔ ان کا ذہن صحت مندانہ اور نقطہ نظر بہت معتدل ہے اور انہوں نے نہایت درجہ مستند علما کی تفاسیر و دیگر کتب سے استفادہ کیا ہے۔ کتاب میں مشمولہ آیات کے الفاظ معہ ترجمہ کا آخر میں ایک انڈکس ہے' مختصر عربی قواعد' ضروری گردانیں اور ضمائر پر مشتمل چند صفحات بھی شامل ہیں ۔

آیات احکام کا پہلے اردو ترجمہ دیا گیا ہے' پھر انگریزی ترجمہ اور پھر تشریح ۔ پاس ہی صفحہ نمبر ۵۸ پر سزائے رجم کا ذکر ہے جس کا ماخذ حدیث و سنت بتایا گیا ہے۔ اگر قرآنی آیات کی بحثوں کے ساتھ اس کو درج کرنا تھا تو مفصل حاشیے میں یہ واضح کرنا تھا کہ یہ سزا پہلے سے کتاب اللہ (تورات) میں موجود تھی جسے حضورؐ نے برقرار رکھا اور آپؐ کے اسے قانون قرار دینے کے بعد وہ بھی واجب الاتباع ہوگئی۔ ضمناً مخالفینِ رجم نے جو بڑی ماہرانہ بحثیں ان دنوں کی ہیں ان کا تجزیہ و تنقید کرنا لازم تھا۔ یہ کمی رہ گئی ۔

ص ۶۰ پر مشہور حکم درج ہے کہ "سزا دہی کے وقت اہل ایمان کا گروہ موجود رہے"۔ لیکن آج جو برسرعام سزادہی کے مطالبے اور چرچے ہیں ان میں یہ پہلو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ مجرموں اور غنڈوں اور چھاپہ ماروں اور اشتعال پذیر ہجوموں کا دور ہے۔ فرض کیجیے آپ نے کسی سزا دہی کا انتظام کیا اور یکایک کوئی بڑی ٹولی اسلحہ سے کام لے کر تمام لوگوں کو منتشر کر دیتی ہے۔ اور وہ مجرم کو چھڑا لے جاتی ہے یا اسے خود مار دیتی ہے' یا سزا دینے والے حاکم کو جو موقع پر موجود ہے اغوا کر کے لے جاتی ہے تو پھر کیا ہوگا۔ اس دور میں لازماً" بند احاطوں کے اندر سزائیں دی جانی چاہئیں ۔ اور آیت صرف **طائفۃ من المومنین** کی موجودگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ طائفہ ۲۰ '۴۰ '۶۰ افراد کا ہو سکتا ہے جنہیں اندر داخل ہونے کے پاس ملیں (جیسے عدالتوں میں بھی ہوتا ہے) اور ان کی خاص جگہیں بنی ہوں ۔ آخر اس میں مخالفہ شریعت بات کیا ہے۔ برسرعام والی صورت تو خطرناک ہے۔

ص ۶۴ پر قذف کے سلسلے کی بحث ہے جو زنا کے بارے میں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص دوسرے پر چوری ' رشوت ' جھوٹ ' بدکاری ' جوئے یا کسی اور برائی کا برسرعام الزام لگائے تو شریعت کا قانون کیا ہے۔

خوب سیرت: ازجناب حکیم محمد سعید صاحب ۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس ناظم آباد' کراچی ۷۴۶۰۰۔ ہلکے سبز رنگ کے ڈیزائن صفحہ پر سیاہ طباعت ' سرورق رنگین و دبیز ' صفحات ۴۴۔ قیمت دس روپے۔

اس کتاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر ارشادات پیش کئے گئے ہیں جن کا تعلق شائستگی اور آداب و اخلاق سے ہے ۔ مثلاً "**الطھور شطرا لا یمان**" یا "**انزل الناس منازلھم**" ان فرمودات نبویؐ پر عنوان لگا کر ان کے تحت ترجمہ و تشریح کی نہایت سلیس اور موثر عبارات خود حکیم سعید صاحب نے تحریر فرمائی ہیں۔ یہ اپنے سلسلے کی پہلی کتاب ہے' اور اس سلسلہ کی ہر کتاب چالیس احادیث پر مشتمل ہوگی سلسلہ نونہال ادب کے تحت یہ بہت اچھا اور مفید کام ہے جس سے بچے' خواتین اور ہر طبقے کے لوگ فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

ماہنامہ وطن دوست: مدیر اعلیٰ جناب بشریٰ رحمان' دفتر اشاعت : وطن دوست لمیٹڈ۔ ۸ سی نظام محمد پارک 'نیو گارڈن ٹاؤن لاہور۔

اس رسالے کو محترمہ بشریٰ بڑی محنت و توجہ سے ترتیب دیتی ہیں۔ خصوصیت سے ان کا اداریہ ایک طرف ادب میں ایک خاص رنگ کا عکاس ہوتا ہے' دوسری طرف معاشرے کو سنورنے کے لئے قارئین کے ذہنوں میں تعمیری رجحانات کے چراغ جلاتا ہے اور تیسری طرف اس میں کچھ نہ کچھ رنگ تصوف بھی جھلک جاتا ہے۔ نظمیں اور کہانیاں جدید انداز کی ہوتی ہیں۔ مگر ایک تو لغویات سے خالی اور دوسرے کسی اچھی تہذیبی قدر یا تعمیری مقصد کی آئینہ دار۔ میں بیشتر اس رسالے کو غور سے پڑھتا ہوں۔ بشریٰ رحمان عورت کی مظلومیت کا خصوصی احساس رکھتے ہوئے اس سے پوری ہمدردی کرتی ہیں مگر آجکل کی نمائش کار عورتوں اور مغرب سے نظریہ نسائیت لینے والے مردوں کی ایجاد کردہ فضول ' باغیانہ ' اور لڑاکوؤں کی زبان اختیار نہیں کرتیں۔ بلکہ صرف اچھے جذبات کو اپیل کر کے اور اکسا کر وہ اصلاح کی کوشش میں لگی ہیں۔ وہ اپنا مدرسہ فکر خود ہی ہیں۔ اور اسی لئے وہ دلوں اور دماغوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ غرض وطن دوست کا ہر پرچہ ایک شعر ہوتا ہے اور یہ شعر سراپا بشارت۔

الشفا من : روہنگیا اراکان کے مسلمانوں کا ترجمان

اگست ۱۹۹۱ء کا عربی شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے نگران اعلیٰ ڈاکٹر محمد یونس صاحب ہیں۔ مجلس مشاورت میں مندرجہ ذیل ارکان شامل ہیں۔ مولانا سیف الاسلام ' پروفیسر محمد زکریا ' سیّد سعید الرحمان' سید اظہار میاں اور سید عبدالرشید۔ مدیر اعلیٰ ابواسد داروغہ صاحب اور نائب مدیر سیف اللہ خالد۔

بہترین کاغذ' نہایت عمدہ طباعت' جاذب نظر گٹ اپ اور دلکش و دلفریب مختلف خوبصورت رنگوں کے لباس میں شائع کیا گیا ہے۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے وہ اپنے مقصد کے ترجمان ہیں۔ یہ رسالہ وطن کی جنگ آزادی لڑنے والے اور جہادِ اسلامی کی روح کو حیاتِ جاوداں بخشنے والے نوجوانوں کی امنگوں' تمناؤں ' آرزوؤں اور خواہشات کا نقیب' داعی ' ترجمان اور معاون و مددگار ہے۔ یہ اس تنظیم کے جیالوں ' بہادروں اور نڈر و جفاکش جوانوں کے دلوں کی آواز ہے جو اپنے وطن کی حریت و آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ کر عزم تازہ لیے ہوئے میدانِ عمل میں نکلے ہیں۔ یہ تنظیم اراکان کے مسلم نوجوانوں کی تنظیم ہے۔

اراکان ' جنوب مشرقی ایشیا میں واقع ہے۔ ۱۷۸۴ء تک یہاں پر مسلمانوں کی بلا شرکت غیرے حکومت تھی۔ آج اراکان کا رقبہ تقریباً سولہ ہزار مربع میل ہے۔ آبادی ۴۰ لاکھ کے

قریب ہے۔ دو بڑے نسلی گروہ روہنگیا اور مگھ یہاں آباد ہیں ۔ روہنگیا نسل کے مسلمانوں کا تناسب آبادی ستر فیصد ہے اور اس کے مقابلہ میں مگھ نسل لوگوں کی آبادی پچیس فیصد ہے۔

مسلمان تاجر پہلی بار ساتویں صدی عیسوی میں تجارت کی غرض سے اراکان میں داخل ہوئے اور ۱۴۳۰ء میں ان کی حکومت قائم ہوگئی ۔ ساڑھے تین سو سال تک ان کی فرمانروائی کی سطوت و شوکت کے پھریرے فضاءِ نیلگوں میں لہراتے رہے اور امن و سلامتی اور توحید و سنت کا پیغام خوابیدہ و بیدار لوگوں کو سناتے رہے ' پیغامِ حق کی یہ صدا برما کے باسیوں کو ناگوار گزری اور انھوں نے ۱۷۸۷ء میں اراکان پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا ۔ ۱۸۲۴ء میں سمندر پار استحصالی قزاقوں اور لٹیروں یعنی انگریز نے برما پر قبضہ جمالیا' اس طرح اراکانیوں کی حریت اور آزادی کا سورج ایک خاص وقت تک کے لیے غروب ہوگیا' اپریل ۱۹۴۲ء میں مسلح مگھوں نے روھنگیوں پر دھاوا بول دیا۔ ان کے گھروں کو مسمار کیا' سازوسامان کو نذر آتش کیا' جانوروں مویشیوں کو لوٹ لیا' دیہاتوں اور قصبوں کا صفحہ ہستی سے نام و نشان مٹا دیا ۔ اور ایک لاکھ کے لگ بھگ روھنگیوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بناکر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

غاصب و ظالم اور سفاک مگھوں اور انگریزوں نے روھنگیوں کی سماجی ' ثقافتی ' مذہبی سرگرمیوں پر ہر طرح کی پابندیاں نافذ کر دیں ' طلبہ تنظیموں یا انجمنوں کو غیر قانونی قرار دے کر ان کی ہر قسم کی عملی سرگرمیوں کو بند کر دیا ۔ اقتصادی ' مذہبی اور سیاسی میدانوں میں بھی طرح طرح کی ایذا رسانی کو روا رکھا' مسلمانوں کی اراضی غصب کر کے غیر مسلموں کو بغیر کسی استحقاق کے دے دی۔ مسلمانوں کی مساجد اور تبلیغی مراکز کو غیر قانونی قرار دے کر بند کر دیا اور روھنگیوں کو بے وطن شہری اور بنگلہ دیش سے آئے ہوئے غیر قانونی مہاجر قرار دیکر اراکان سے بے دخل کر دیا۔

ایسی گھمبیر ظالمانہ و سفاکانہ صورت حال کو دنیا کے سامنے رکھنے اور اپنی مظلومانہ کیفیت اور حالتِ زار کو عیاں کرنے کے لیے اراکان کی مسلم تنظیم کے سربراہ نے "التضامن" نامی عربی رسالے کا اجراء کیا ہے ۔ اس میں جہاد اسلامی کی روحِ خوابیدہ کو بیدار کرنے والے مضامین ہیں اور ایسے واقعات ہیں جو دنیا کے ضمیر کو جھنجوڑتے اور بیکسوں اور مظلوموں کی داد رسی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

(عبدالوکیل علوی)

ڈاکٹر محمد امین

کی تازہ ترین تصنیف :

عصرِ حاضر اور
اسلام کا نظامِ قانون

- اسلامی قانون کی اصطلاحات، تاریخ اور مآخذ پر سیر حاصل تبصرہ
- اسلامی قانون اور عصری مسائل کے ضمن میں اسلامی قانون کی تدریس، موجودہ عدالتی ڈھانچے اور پارلیمنٹ کے حقِ قانون سازی جیسے مسائل کا بھرپور تجزیہ
- پاکستان میں اسلامائزیشن کے قانونی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ (قیامِ پاکستان سے لے کر پیپلز پارٹی کے دورِ ثانی تک)

اعداد و شمار کے جداول اور اہم ضمیمہ جات سے مزین

- وکلاء، طلبہ، ممبرانِ عدلیہ، صحافیوں اور پاکستان میں اسلامی قانون کی تطبیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے

ایک ناگزیر تحقیقی کتاب ——

صفحات : ۲۸۰ ○ سائز : ۲۳ × ۳۶ / ۱۶

قیمت : ۶۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

REGD. NO L 5348 PHONE : 234014 236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مُختصر حواشی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی